ہفت روزہ
زندگی
لاہور

۳ر نومبر ۱۹۶۹ء

آگ سے کھیلنا بچوں کا محبوب مشغلہ ہے، لیکن اب بڑے بھی اس "فن" میں طاق ہوتے جا رہے ہیں۔

سات تصویریں

یہ دورِ ترقی

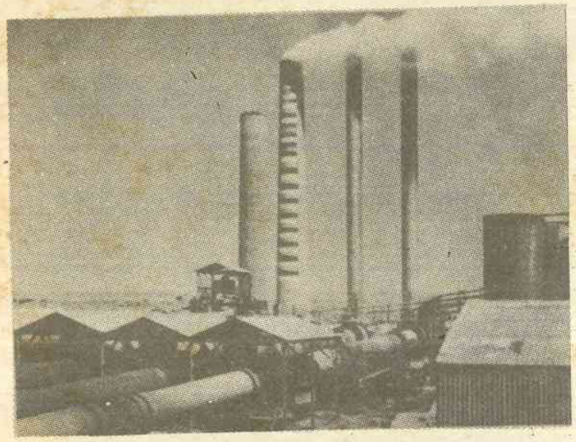

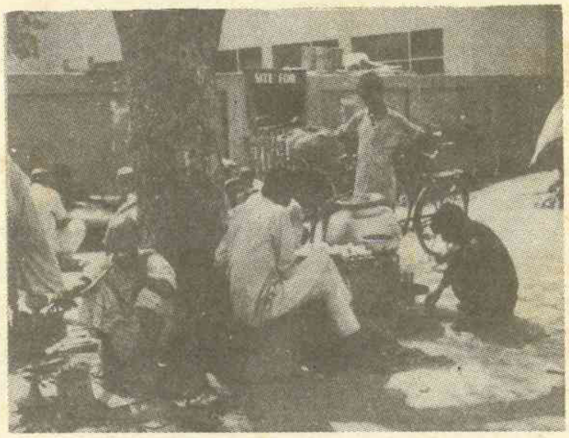

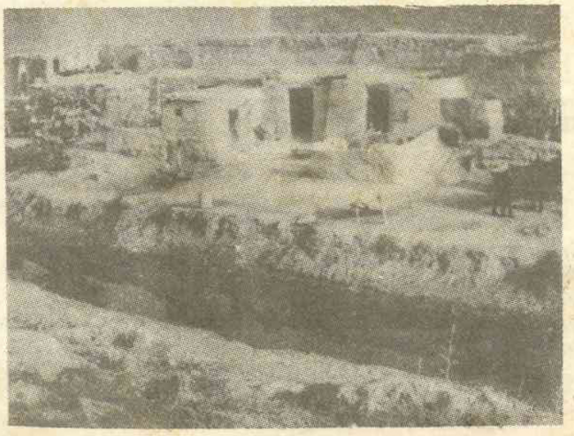

ہفت روزہ **زندگی** لاہور

تعدادِ اشاعت : ۴۰ ہزار

۳ر نومبر ۱۹۶۹ء

جلد : ۸ شمارہ : ۹

مدیرِ اعلیٰ : ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی

مدیرِ مسئول : الطاف حسن قریشی

مدیر : مجیب الرحمٰن شامی

"وہ خاتون جنہیں کالج کا پرنسپل مقرر کیا گیا، سری نگر یا کسی اور مقام پر ایک سکول میں پڑھاتی تھیں۔ ان کے پاس اس وقت ایم۔ اے کی ڈگری بھی نہ تھی، لیکن انہیں ڈگری کالج کا پرنسپل مقرر کر دیا گیا۔ جس وقت کالج کھلا فرسٹ ایئر میں اور تھرڈ ایئر میں صرف ۱۸ لڑکیاں تھیں اور انہیں پڑھانے والے اساتذہ ستائیس کے لگ بھگ تھے۔ فرسٹ ایئر اور سیکنڈ ایئر کے لیے ہائر سیکنڈری بورڈ کی منظوری حاصل کرنا ضروری تھا۔ یونیورسٹی نے منظوری کے لیے لکھا، مگر بورڈ نے یہ کہہ کر منظوری دینے سے انکار کر دیا کہ اس کالج کی پرنسپل ایم اے نہیں ہیں۔"

رازونیاز سے آگے

ص ۱۱ پر ملاحظہ فرمائیے

آئینہ

		صفحہ
تذکرہ و تبصرہ		
آج اور کل	زیڈ۔ اے سلہری	۵
ایک صحافی کی ڈائری	ضمیر صدیقی	۱۹
باچا خان	ملک نصراللہ خان عزیز	۳۴
ٹیلی ویژن		۳۹
ایک پُراسرار واردات		۳۷
اخبارات سے اخبارات تک		۴۱
سعید احمد کی کرکٹ بدری	مبصر	۳۲
وطن کی بات		
امورِ پاکستان		۷
آزاد کشمیر میں آئین سازی	محمد اکرم خاں	۲۲
اجنبی نوجوان نے جلسہ لوٹ لیا	ناصر عباس	۲۴
مفتی محمود کا سانپ	مجیب شامی	۲۵
شیخ مجیب اور سوشلزم	مظفر احسن	۲۶
اندازِ جہاں		
عالمی امور		۸
بیروت کی ڈائری	احمد برأت	۲۰
انکشافات		
رازونیاز سے آگے	الطاف حسن قریشی	۱۱
محکمۂ سیاحت کے کارنامے	نجم الحسن	۱۵
طنز و مزاح		
اڑیں گے پُرزے	تماشائی	۳۰

سالانہ : ۲۵ روپے، ششماہی : ۱۳ روپے، سہ ماہی : ۷ روپے،

فی پرچہ : ۶۰ پیسے،

بحرین : ۶۰ فلس ـــ قطر : ۱/۲ ریال ـــ انگلستان : ۲ شلنگ ۲ پنس ـــ سعودی عرب : ۱۲ قرش،

ہفت روزہ "زندگی" سمن آباد (لاہور)

مصطفیٰ صادق پبلشر، الطاف حسن قریشی پرنٹر نے اردو ڈائجسٹ پرنٹرز سرکلر روڈ لاہور سے چھپوا کر ۲۱۔ ایکڑ سکیم سمن آباد لاہور سے شائع کیا

بنامِ زندگی

"ایک سیاسی کہانی" کے زیرِ عنوان پی ڈی پی کنونشن کی جو روداد "زندگی" میں چھپی ہے، اس میں میرا ذکر اس طرح آیا ہے کہ اس سے شبہات پیدا ہونے کا خدشہ ہے۔ میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ :

۱ : میں نے قرآن و سنت والی ترمیم کی مخالفت نہیں کی بلکہ میں اس کا حامی تھا۔

۲ : میں خود بخود سیکرٹری نہیں بنا، بلکہ مجھے یہ کام سپرد کیا گیا تھا۔

۳ : میں نے ترمیمات کے مسودے اسی ترتیب سے پڑھے جس ترتیب سے مجھے دیئے گئے تھے۔ یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ میں نے جان بوجھ کر قرآن و سنت کے الفاظ شامل کرانے کی ترمیم والا مسودہ دیر سے پڑھا۔

منظر بشیر ایڈووکیٹ لاہور۔

*

اشتراکیوں کی نفسیات ہر جگہ ایک سی ہے۔ پاکستان میں صدارتی انتخاب ہوئے تو کامریڈ بھاشانی، اپوزیشن سے وابستگی کے باوجود، بیمار پڑ گئے اور ان کا نائب ایوب صاحب کے گلے میں ہار ڈالتا رہا۔ بالکل یہی ڈرامہ پچھلے دنوں مصر میں کھیلا گیا۔ رباط کانفرنس کے آغاز سے عین پہلے ناصر صاحب کو انفلوئنزا ہو گیا اور ان کے دستِ راست ہیکل کانفرنس کو سبوتاژ کرنے میں برابر مصروف رہے۔

چودھری محمد اختر، احمد پور شرقیہ

*

موجودہ بجٹ سے قبل سلک پر ۱۰۰ روپے فی لوم ایکسائز ڈیوٹی تھی جو یک لخت بڑھا کر ۵۰۰ روپے فی لوم کر دی گئی۔ نتیجۃً ڈیوٹی کی چوری بہت بڑھ گئی صنعت کاروں نے پیداوار پر ڈیوٹی ادا کرنے کے اجازت نامے حاصل کر لیئے ہیں اور بہت زیادہ مال بغیر ڈیوٹی کے نکل رہا رہا ہے۔ اس وقت حکومت کو اتنی ڈیوٹی بھی وصول نہیں ہو گی جتنی ۱۰۰ روپے فی لوم کے زمانے میں ہوتی تھی۔ پانچ گنا ڈیوٹی بڑھانے کا فائدہ صرف ایکسائز انسپکٹروں اور افسران کو پہنچا ہے۔

ایک صنعت کار

*

گورنر کانفرنس میں گندم کا نرخ دو روپے فی من بڑھانے کا اعلان کیا گیا ہے، مگر یہ رعایت کافی نہیں۔ بورڈ آف اکنامکس انکوائری کی رپورٹ کے مطابق کاشت کار کا ایک من گندم پیدا کرنے پر پندرہ روپے سینتیس پیسے خرچ آتا ہے۔ حال ہی میں واپڈا نے ٹیوب ویل موٹروں پر چھ روپے فی ہارس پاور کے حساب سے دوہرا ٹیکس عاید کر دیا ہے، جو کاشت کاروں کے لیے از حد پریشانی کا باعث بن گیا ہے۔ اس لیے زراعت کے سلسلے میں سرکاری پالیسیوں کو بہتر بنانے کی ضرورت ہے۔

چودھری ارشاد اللہ تارڑ ایڈووکیٹ حافظ آباد۔

*

آپ سوشلزم کے خلاف کھلم کھلا اور ون یونٹ کے خلاف چپکے چپکے جو پروپیگنڈہ کر رہے ہیں اس نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ آپ یقیناً کسی سیاسی گروہ کے آلۂ کار ہیں۔

امتیاز رشید ۱۷۸/C گمٹی بازار لاہور۔

*

قیامِ پاکستان کا مقصدِ وحید یہاں اسلامی نظام کا قیام تھا، مگر افسوس ہمیں ہر موقعے پر دھوکے میں رکھا گیا۔ پہلے وطنِ عزیز کو اینگلو امریکی بلاک کا دم چھلا بنایا گیا اور اب کچھ رہنما یہ پٹی پڑھانے میں مصروف ہیں کہ تمھاری نجات ماؤ اور مارکس سے وابستگی میں ہے۔ عمر خطاب۔ تنجر ضلع سوات۔

*

آپ نے "زندگی" کے ۲۷ اکتوبر کے شمارہ میں میری معروضات شائع فرما کر دیانت دارانہ صحافت کی جو مثال قائم کی ہے، دعا ہے کہ آپ کی قائم کی ہوئی یہ مثال، دوسروں کے لیے نمونہ بن جائے تاکہ ملکِ عزیز کی صحافت میں ایمان داری کا معیار قائم ہو سکے۔

میں آپ کی مہربانی کے لیے تہِ دل سے شکر گزار ہوں اس کے ساتھ ہی، اپنے مکتوب میں آپ کے مضمون کے ایک حصہ کے بارے میں "زرد صحافت" کا لفظ استعمال کرنے پر بہت نادم ہوں اور اس کے لیے آپ سے معذرت کا خواستگار ہوں۔ صلاح الدین (ایڈووکیٹ)

چند ضروری گزارشات

ہفت روزہ "زندگی" میں ایسے مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں جن میں کسی واقعے کے بارے میں اندر کی کہانی بیان کی جاتی ہے ..... یہ کہانی مختلف ذرائع سے مہیا کی ہوئی معلومات پر مبنی ہوتی ہے۔ ہم اپنی طرف سے اس بات کی پوری کوشش کرتے ہیں کہ واقعات زیادہ سے زیادہ صحیح ہوں — ہمارے پیشِ نظر کسی شخصیت کو ہدفِ تنقید بنانا نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی کسی ذمہ دار شخص کی وضاحت آئی، ہم نے اسے قارئین کے سامنے پیش کر دیا۔ پی۔ ڈی۔ پی کنونشن کے سلسلے میں الطاف حسن قریشی کا جو مضمون "ایک سیاسی کہانی" کے زیرِ عنوان چھپا تھا جناب صلاح الدین نے اس کے بعض حصوں سے اختلاف ظاہر کیا۔ ہم نے گذشتہ شمارے میں ان کا طویل خط چھاپا تھا۔ اب ان کے بعض ساتھیوں نے ان کی رائے اور بیان کردہ واقعات سے اختلاف کا اظہار کرتے ہوئے "ایک سیاسی کہانی" میں بیان کردہ واقعات کو صحیح قرار دیا ہے۔ ہم اگلے ہفتے وہ رُخ پیش کریں گے جو ان کے ساتھیوں نے دیکھا اور محسوس کیا۔

*

گذشتہ شمارے میں "کیا جوان خون یونہی بہتا رہے گا؟" میں چند معمولی معمولی غلطیاں رہ گئیں، ہم ان کا ذکر ضروری سمجھتے ہیں۔

- راولپنڈی میں اصل ہنگاموں کا آغاز ۷ نومبر سے ہوا تھا۔
- جناب عاشق حسین گیلانی نے خط لکھا ہے کہ وہ ہسپتال میں موجود نہ تھے۔

صفحہ نمبر ۱۵ پر پیراگراف نمبر ۲ کو جو صفحہ نمبر ۳ پر بھی چھاپا گیا ہے، یوں پڑھا جائے :

"واقعۂ قتل کے وقت گارڈن کالج میں این۔ ایس۔ ایف کے کارکن موجود تھے۔ تقریباً اسی وقت کوثر ہوٹل میں (یہ ہوٹل گارڈن کالج کے بہت قریب ہے) این۔ ایس۔ ایف کی شاخ کا افتتاح ہونے والا تھا اور یہ کارکن اپنے ہم خیال طلبہ کو بلانے کالج گئے ہوئے تھے۔ سنا ہے چند رپورٹر بھی اس علاقے میں تھے۔ واقعۂ قتل کے فوراً بعد این۔ ایس۔ ایف کے چند ارکان جلدی جلدی کوثر ہوٹل میں آئے، ان کا اصل پروگرام خاصا طویل تھا مگر انہوں نے سب کچھ پندرہ منٹ میں بھگتایا۔ این۔ ایس۔ ایف کا جھنڈا اتارا اور چلے گئے۔ کوثر ہوٹل پر کئی روز سے این۔ ایس۔ ایف کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔" ——

آج اور کل

زیڈ اے سلہری

پُوری قوم کو عقل سے عاری سمجھنا خام خیالی ہے

معاشرے سے رشوت کی لعنت کو دُور کرنے کا ہمیشہ زور شور سے مطالبہ کیا جاتا رہا ہے، لیکن اب تک سرکاری اور غیر سرکاری کوششیں بار آور نہیں ہوئیں۔ موجودہ حکومت نے بدکار حکّام کی سرزنش کا مستحسن اقدام کیا ہے، لیکن اس مرض کا بآسانی علاج مشکل ہے۔ رشوت کا بازار گرم ہونے کے کئی اسباب ہیں۔ ایک تو یہی کردار کی کمزوری ہے۔ عجب چیز ہے کہ آزادی سے پہلے جب قوم اقتصادی لحاظ سے حد درجہ پس ماندہ تھی، معاشرہ اتنا گندا نہ تھا جتنا آج ہے۔ شاید زمانۂ غلامی میں افلاس نے ہمارے اندر وہ ہوس پیدا کر دی، جس کی تسکین کا اب سامان مہیا ہوا۔ بہرحال ہر طرف نفسا نفسی کا عالم ہے اور ہم قناعت کے سرمائے سے تہی دامن ہوتے جا رہے ہیں۔ معاشرے کی خرابی کے دوسرے اسباب بھی ہوں گے، لیکن ایک سبب جس کی اب تک نشاندہی نہیں کی گئی وہ یہ ہے کہ پچھلے گیارہ سال میں انتظامیہ عوامی تنقید سے قطعی محفوظ رہی۔ ایوبی دور میں اخباروں کی آزادی بالکل سلب ہو گئی پریس پر گوناگوں بندشوں کا مقصدِ اولیٰ صدر ایوب کو منزّہ عن الخطاء ثابت کرنا تھا۔ شخصی راج میں بظاہر ایک فرد کی حکومت ہوتی ہے، لیکن دراصل آمر کی آمریّت نوکر شاہی کے گہرے اشتراکِ عمل پر ہی قائم ہوتی ہے۔ بظاہر آمر پورے اختیارات کا منبع و ماخذ نظر آتا ہے، اگر وہ اپنے لامحدود اختیارات حکام کے ذریعے ہی استعمال کر سکتا ہے؛ چنانچہ ایک ایسا نظام بروئے کار آتا ہے جس کے تحت جہاں ایک طرف آمر نوکر شاہی کو اختیارات تفویض کرتا ہے تو دوسری طرف نوکر شاہی آمر کی ذاتی اور غیر ذاتی خواہشات کو بجا لانے کا فریضہ ادا کرتی ہے۔ بالفاظِ دیگر آمر کو تنقید سے بالا رکھنے کا اصول کل انتظامیہ پر لاگو ہوتا ہے۔ نہ آمر کوئی غلطی کر سکتا ہے نہ اس کی مشینری۔ نتیجہ یہ نکلا کہ نہ صرف صدر ایوب کی ذات ہدفِ تنقید نہ بن سکی، بلکہ اعلیٰ حکام کو تو چھوڑیئے، تحصیلدار اور پٹواری تک اس کی گرفت میں نہ آ سکے۔

اب خیال کیجئے کہ جب انتظامیہ گیارہ طویل سالوں تک عوامی احتساب سے آزاد رہے تو اس کے کارکنان نے کیا کیا من مانی نہ کی ہوگی۔ بے شک انسان کا کردار ایسا ہونا چاہیے کہ وہ مثبت اقدار کی روشنی میں اپنے طرزِ عمل کو اچھے خطوط پر منضبط کرے۔ محض اللہ کی رضا کے لیے نیکی افضل فعل ہے لیکن یہ بھی انسانی فطرت کا خاصہ ہے کہ آدمی معاشرے کے ڈر سے برائیوں سے اجتناب کرے بلکہ زیادہ تر اس کی نیک اعمالی اسی خوف کی رہین ہوتی ہے۔ قرآنِ کریم نے خشیّتِ الٰہی کو بہت اہمیت دی ہے۔ ایوبی دور میں انتظامیہ کے عمّال کو عوام کا کوئی ڈر نہیں رہا۔ وہ بے خوف جو حرکت چاہتے کرتے، اگر انہیں کسی کی خوشنودی کی ضرورت تھی تو وہ صدر کی۔ جب تک ان کی نظرِ عنایت شامل حال رہتی انہیں عوام سے دادِ تحسین حاصل کرنے کی کوئی احتیاج نہ تھی۔ اخبارات میں یہ طاقت ہی نہ تھی کہ وہ حکام سے باز پرس کرتے اور تنقید کی روشنی میں حکومت کی کمزوریوں کو فاش کرتے۔

فیلڈ مارشل ایوب — جنہوں نے عوام کے بجائے نوکر شاہی کے سہارے حکومت کی۔

اصل میں دیکھا جائے تو جمہوریت کا مطلب ہی انتظامیہ پر حقِ نگہداشت کا استعمال ہے۔ انگریز جو چاہے کرتا تھا عوام اسے ٹوک نہ سکتے تھے۔ اسے دورِ غلامی کہتے تھے۔ اس کے برعکس آزادی کا مفہوم ہی یہ ہے کہ قوم اور قوم کا ہر فرد اپنے حکمرانوں پر تنقید کا حق رکھتا ہو۔ اگر یہ حق حاصل نہ ہو اور اس کے استعمال کی راہیں مسدود کر دی جائیں، تو معنوی طور پر آزادی غلامی میں تبدیل ہو جائے گی۔ جمہوری ملکوں میں حکومت کو صراطِ مستقیم پر رکھنے کے لیے کئی عوامل کارفرما ہوتے ہیں مثلاً برطانیہ میں پارلیمان میں حزبِ اختلاف کا وجود ہے۔ پھر آزاد پریس ہے۔ ان دو کے علاوہ ٹریڈ یونین ہیں، تجارتی اور صنعتی فیڈریشن ہیں۔ ان اداروں کی شبانہ روز سرگرمیٔ عمل حکومت کو ہر لحظہ چاق و چوبند رکھتی ہے۔ وہ اپنے کارندوں کا ہر وقت محاسبہ کرتی رہتی ہے۔ اگر آج برطانیہ میں ان اداروں پر بندش عائد ہو جائے تو وہاں بھی صورتِ حال وہی ہو جائے گی جس سے پاکستان پچھلے گیارہ سالوں سے دوچار رہا ہے۔ فرضِ تنقید کے تعطّل سے کرپشن کا پھولنا پھیلنا لازمی اور لابدی ہے۔

ہمارے ساتھ تو ایک کریلا دوسرے نیم چڑھا والا معاملہ ہوا۔ سیاستدانوں کی جبلی کمزوری نوکر شاہی کے مزاج کو اس نئے سانچے میں ڈھالنے کے آڑے آئی، جس کا ایک نو آزاد ملک کو تقاضا ہوتا ہے۔ ہماری بیوروکریسی اصل میں انگریزوں کے نقطۂ نظر کی قائل تھی کہ عوام تو ہوتے ہی اس لیے ہیں کہ ان پر حکومت کی جائے۔ اس پر طرّہ یہ کہ ایوب راج قائم ہو گیا۔ اس راج کی بنیاد ہی اس اصول پر رکھی گئی تھی کہ قوم جاہل ہے اور اسے ایک سخت گیر رہبر کی ضرورت ہے۔ چونکہ یہ راج صدر کی شخصیت اور نوکر شاہی کے اشتراکِ عمل پر قائم تھا، حکام کا عوام کے متعلق وہی مطمحِ نگاہ قائم ہوا جو خود صدر ایوب

کا تھا۔ اب قوم ایک طرف تھی اور رہبروں کا جتھہ دوسری طرف نوکرشاہی کا اندازِ عمل اس نظریے سے صیقل ہوا کہ بیوروکریسی کے چند افراد ہی قوم میں بہترین صلاحیتوں کے حامل تھے، وہ سب سے زیادہ تعلیم یافتہ اور سب سے زیادہ لائق تھے۔ مقامِ افسوس ہے کہ حال ہی میں اس رائے کی صدائے بازگشت دوبارہ سنی گئی۔ اوّل تو قوم کے پس ماندہ ہونے کا تصور گمراہ کن ہے۔ ٹھیک ہے کہ ہمارا معیارِ زندگی ترقی یافتہ ملکوں کے مقابل میں پست ہے، بلکہ بہت پست ہے، لیکن اس امر کا سیاسی شعور سے کوئی تعلق نہیں۔ جس سیاسی شعور کا ثبوت اس قوم نے پاکستان کی تخلیق کے عمل سے دیا ہے، تاریخ میں اس کی مثال نہیں۔ سوال یہ ہے کہ جو قوم انسان کی اعلیٰ ترین خصوصیت ذوقِ تخلیق کی شناسا ہے وہ قوم ملک کے مفاد کی نگہداری کے کیوں ناقابل ہے۔ دوسرے یہ دعویٰ غلط ہے کہ اعلیٰ دماغ نوکرشاہی کے تنگ دائرے تک محدود ہیں۔ اس بارہ کروڑ کی قوم میں لاکھوں نہیں تو ہزاروں افراد بڑی قابلیتوں کے مالک ہیں۔ کیا یونیورسٹیوں کے اساتذہ جہلاء میں شمار ہوتے ہیں؟ کیا ملک کے تمام دانشور سی ایس پی بن چکے ہیں؟ کیا سی ایس پی کی ترتیب میں صوبائی کوٹہ سسٹم بہترین تنظیم کا مظہر ہے؟ کیا انجینئر، وکلا، سیاستدان عقل و دانش سے عاری ہیں؟ کیا وہ لوگ جنہوں نے بڑی بڑی صنعتیں لگائیں، کارخانے چلائے، برآمد اور درآمد کی طویل و عریض تجارتیں کیں، کروڑوں کے سرمائے سے بنک قائم کئے، کند ذہن اور غبی کہلا سکتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جتنی صنعتیں بھی حکومت کی تحویل میں آئیں وہ ناکام ثابت ہوئیں، کیونکہ جو حکام وہاں لگائے گئے وہ نااہل نکلے۔ اس امر کا اعتراف خود حکومت کے اعلیٰ ترجمانوں نے کیا ہے۔ پھر صحافیوں کی صفیں داناؤں کے عنصر سے کیوں خالی گردانی جاتی ہیں؟ پوری قوم کو عقل کی دولت سے محروم سمجھنا خام خیالی ہی نہیں خطرناک نظریہ ہے۔ دو چیزوں میں اجارہ داری ناقابلِ قبول ہے؛ وطن کی محبت اور سوچنے سمجھنے کی اہلیت۔ سچ تو یہ ہے شاذ و نادر ہی نوکرشاہی کے ارکان غیر معمولی قابلیت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ تمام تر وہ ایک دی ہوئی ڈگر پر چلنے کے خوگر ہیں۔ مکھی پر مکھی مارتے ہیں، تقلید پر جان دیتے ہیں، جو ایک بار کیا اسے دہراتے رہتے ہیں۔ یعنی جو فیصلہ ایک دفعہ ہوا اسے اٹل سمجھتے ہیں۔ ان میں اپج کا مادہ عنقا ہے۔ اس کی کوئی شکایت بھی نہیں۔ دنیا بھر کے سیکرٹریٹ اس طرح چلتے ہیں لیکن کہیں بھی یہ ادعا نہیں کیا گیا کہ حکومت کے ملازمین ملک کے صالح ترین افراد ہیں۔ ہمارے حکام کی قلعی تب کھلتی ہے جب وہ ریٹائر ہو کر عام زندگی کی تجربہ گاہ میں داخل ہوتے ہیں۔ اکثر و بیشتر وہ جس کام کو ہاتھ لگاتے ہیں اس میں ناکام ہوتے ہیں، کیونکہ ان میں زندگی کے نشیب و فراز کو سمجھنے کی صلاحیت ہی ختم ہوگئی ہوتی ہے۔ اگر افسر لوگ ریٹائر ہونے سے گھبراتے ہیں تو اس لیے کہ بازار میں ان کی قیمت بہت کم پڑے گی اور وہ رعب و داب ختم ہو جائے گا جس کی بنا پر وہ جذبۂ انانیت سے سرشار رہتے ہیں، چونکہ وہ دورانِ ملازمت میں تحکم سے کام لیتے تھے اور انہوں نے کوئی کام اس نقطۂ نگاہ سے سرانجام نہیں دیا کہ وہ اس خدمت کا تقاضا تھا جس پر وہ فائز تھے اور جس کے لیے وہ قومی خزانے سے تنخواہ پاتے تھے، ریٹائر ہونے کے بعد عوام انہیں منہ نہیں لگاتے۔ نوکرشاہی کے نظریۂ تفوّق کا دوسرا برا پہلو یہ ہے کہ ہمارے وہ نوجوان جن میں ایسے شعبوں میں داخل ہونے کی اہلیت ہے، مثلاً سائنس اور ٹیکنالوجی جن پر موجودہ انسانی ترقی کا دارومدار ہے اور جن پر ملک کے مستقبل کا انحصار ہے، ان سے کتراتے ہیں اور محض نمود و نمائش اور ٹیپ ٹاپ کے لیے اپنے جوہر نوکرشاہی کی نذر کر دیتے ہیں۔ کیا کہیں اور بھی یوں ہوا ہے کہ ایک ڈاکٹر اپنے پیشے کو قربان کر کے ڈی سی بننے کی فکر میں لگ جائے؟

حکومت کی حکمتِ عملیوں اور اعمال کا جائزہ آزاد شہریوں کا حق ہی نہیں، فرض ہے۔ ایک آزاد ملک میں حکمرانی کسی خاص طبقے تک محدود نہیں رہ سکتی، لیکن اس جمہوری نظریے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے دو شرائط پورا کرنا ضروری ہے: ایک تو صحافت کی آزادی۔ جب تک اخبار بے دھڑک معاشرے کی کمزوریوں کو (اس میں حکومت کا شعبہ بھی شامل ہے) واشگاف نہ کریں گے، ہم نہ صرف یہ کہ اپنی قومی زندگی کی اصلاح نہ کر سکیں گے، بلکہ ترقی کے اُس زینے پر چڑھنے کی سکت بھی ہم نہ پہنچا سکیں گے جس کے ذریعے ملک کی سالمیت کو استوار کیا جا سکتا ہے۔ جس چیز نے ہمارے ملک کو پسماندہ رکھا اور اس میں پاکستان کی تخلیق کے مخالفوں کو سر اٹھانے کا موقع دیا، وہ یہی ہے کہ حکومتوں نے قوم کو اپنے جمہوری خصائص کو بروئے کار لانے کی اجازت نہیں دی۔ اگر سیاست والوں نے پارلیمانی نظام کے دور میں محض خودغرضی کی وجہ سے انتخابات نہیں ہونے دیے یا اخباروں پر پابندیاں لگائیں، تو ایوبی دور میں انہیں حقِ خود ارادیت کا اہل ہی نہ سمجھا گیا، نتیجہ یہ ہوا کہ سرگرمیٔ عمل سے قومی اعضا میں جو قوت پیدا ہوتی، وہ پیدا نہ ہوئی۔ اس کے خلاف اعصاب میں کسرت نہ کرنے سے اتنی سختی پیدا ہوئی کہ وہ حرکت کے قابل نہ رہے۔ حرکت سے برکت ہوتی ہے اور قوم انتظامیہ کی رہبری پر قطعی محتاج ہو کر اس برکت سے محروم ہوگئی۔ اگر وہ جمہوری تحریک جس کے طفیل پاکستان بنا جاری رہتی، تو ضرور ہم سے غلطیاں بھی سرزد ہوتیں۔ کون سی قوم غلطیوں سے محفوظ و مصئون ہے لیکن جوشِ عمل سے خطوطِ سیاست متعین ہوتے جاتے اور روایتیں قائم ہوتی جاتیں۔ بہر حال ہمارے قدم آگے کی طرف بڑھ رہے ہوتے۔ ہوا یہ کہ ہر عشرے کے بعد ملک سالوں پیچھے پھینک دیا گیا اور پھر سے دستور سازی کی ابجد کی پڑھائی شروع ہوگئی ؎

لیتا ہوں مکتبِ غمِ دل میں سبق ہنوز
لیکن یہی کہ "رفت" گیا اور "بود" تھا

دوسری شرط بھرپور سیاست کا اجراء ہے۔ جب تک سیاسی پارٹیوں کو اپنے آپ کو آزادی سے منظم ہونے کا موقع نہیں ملے گا، وہ انتخابات میں حصہ لینے کے قابل نہ ہو سکیں گی۔ اگر انتخابات تک ہر سیاسی مکتبِ فکر کو عوامی تعلق قائم کرنے کی اجازت ہو، تو جلد ہی یہ معلوم ہو جائے گا کہ کون سی پارٹی کتنی مقبول ہے۔ آہستہ آہستہ میدان میں دو یا تین پارٹیاں ہی رہ جائیں گی اور ان میں تقابل اس امر کا ضامن ہو جائے گا کہ ایک نہ ایک پارٹی حکومت بنانے کی اہل نکل آئے گی۔ اگر ایک پارٹی برسرِ اقتدار آئے گی، تو دوسری پارٹی حکومت پر کڑی نگاہ رکھ سکے گی اور اس طرح نقد و نظر سے ایک ایسی فضا پھیلے گی جس سے معاشرے کی تطہیر ہوتی جائے گی۔ ہماری ضرورت مثالی حکومت کی نہیں ہے۔ کہیں بھی دنیا میں مثالی حکومت قائم نہیں۔ ہماری ضرورت یہ ہے کہ عوام اپنی بساط کے مطابق ادارے قائم کریں۔ جو ادارے ان کی اپنی کوشش سے بنیں گے وہ پائیدار ہوں گے خواہ ان کی سطح چنداں بلند نہ ہو۔ وہ پائیدار اس لیے ہوں گے کہ نہ صرف وہ قوم کے اپنے ہاتھوں کے بنائے ہوں گے، بلکہ ان میں محنت اور محبت کا اتنا ہی سرمایہ لگا ہوگا جس کی قوم میں استطاعت ہے یہ ادارے سربفلک محلات نہ ہوں گے، لیکن ان کی بنیادیں مضبوط ہوں گی اور وہ ایوبی نظامِ صدارت کے قصر کی طرح کھوکھلے نہ ہوں گے کہ عوامی تحریک کے ایک جھونکے سے ڈھے گیا۔ یہ عوامی اور ٹھیٹھ پاکستانی ادارے کھلی بحث و تمحیص کی فضا میں پنپ سکیں گے۔ اس لیے فرضِ تنقید کی ادائیگی، اخباروں کے ذریعے ہو یا سیاسی پارٹیوں کی تنظیم سے، ناگزیر ہے۔ حقِ تنقید کا یہی مطلب نہیں کہ قوم حکمرانی کی حقدار ہے بلکہ اس کا ہر فرد اپنے ملک کے مفاد سے وابستہ ہے اور اس کی بہبودی اس کے لیے موت و حیات کا مسئلہ ہے یہ فرض کسی صورت اور کسی حالت میں معطل نہیں ہو سکتا؛ معاشرے کی صحت کا اسی پر دار و مدار ہے۔ ■ ■

امورِ پاکستان

الیکشن کمیشن

مہاجرین — وطن میں اجنبی

چیف الیکشن کمشنر جناب جسٹس عبدالستار نے کئی روز پہلے ایک ٹیلی ویژن انٹرویو میں ارشاد فرمایا کہ جو مہاجرین ۱۹۵۱ء سے قبل مشرقی پاکستان آئے ہیں، صرف وہی ووٹر بننے اور ووٹ دینے کے مجاز ہوں گے۔ جناب جسٹس نے یہ بھی شرط لگادی کہ مہاجرین کو ایسے سرٹیفکیٹ بھی پیش کرنے ہوں گے، جن سے اس بات کا ثبوت مل سکے کہ وہ فی الحقیقت ۱۹۵۱ء سے پہلے پاکستان پہنچ چکے تھے۔ اسی انٹرویو میں عبدالستار صاحب نے مشرقی پاکستان میں بسنے والے مہاجرین کے اس مطالبے کو بھی مسترد فرمادیا کہ انہیں اردو میں انتخابی فارم اور فہرستیں مہیا کی جائیں۔ اس سے ایک کروڑ سے زیادہ مشرقی پاکستان کے مہاجرین میں شدید ردِعمل ہوا۔ کتنی تعجب کی بات تھی کہ وہ لوگ جو ۱۹۵۴ء اور ۱۹۶۴ء میں ووٹر تھے، اب ووٹ دینے کے مجاز قرار نہ پائے۔ اس وقت ان سے کوئی ثبوت نہیں مانگا گیا تھا۔ زمانے کی ستم ظریفی کہ ان حضرات سے جو آگ اور خون کے دریا عبور کرکے سرزمینِ پاک میں آئے تھے، انہیں یہاں ووٹ دینے کے حق سے بھی محروم کیا جارہا تھا۔ انجمن مہاجرین وانصار کے صدر علامہ راغب احسن صاحب نے اس پر شدید احتجاج کیا اور اسے پوری قوم کو دو حصّوں میں تقسیم کرنے کے مترادف قرار دیا۔ مہاجرین کو مشرقی پاکستان میں پہلے ہی "جلاؤ" اور "گھیراؤ" کا نشانہ بنایا جاتا رہا، اب انہیں بعض حلقے "غیر ملکی" قرار دے رہے ہیں۔ ووٹ دینے کے حق سے یہ محرومی تو گویا اس بات کا پختہ ثبوت تھی کہ وہ واقعی غیر ملکی ہیں۔ اپنے وطن میں اجنبی ہوجانے کی یہ داستان دل خراش بھی ہے اور جگر نگار بھی —— آخر مشرقی پاکستان کے اسّی لاکھ مہاجرین نے فیصلہ کیا کہ اگر سب کو ووٹ کا حق نہ دیا گیا، تو وہ انتخاب کا بائیکاٹ کردیں گے۔ الیکشن کمیشن کو جھکنا پڑا اور ۱۹۵۱ء سے پہلے یہاں پہنچنے کی سند لانے کی شرط ہٹادی گئی، لیکن دوسری شرط ابھی تک قائم ہے، مہاجرین کو اردو جاننے کی سزا یہ دی جارہی ہے کہ فہرستیں اور فارم اردو میں نہیں چھاپے جارہے، گویا "لیلائے ووٹ" سے انہیں محروم رکھنا ضروری ہے۔ اس معاملے میں جذبات شدت پر پہنچ گئے ہیں۔ میرپور اور محمدپور میں ووٹروں نے بنگلہ فارم قبول کرنے سے انکار کردیا ہے۔ سیدپور کے دو طالب علموں نے اس رویّے کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے بھوک ہڑتال کردی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جب تک ان کے مطالبے کو تسلیم نہیں کیا جائے، وہ ہڑتال ختم نہیں کریں گے۔ یہ سطور لکھنے تک یہ مطالبہ تسلیم نہیں کیا گیا، ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر اسے قبول کرنے میں ہچکچاہٹ کیوں ہے؟ جنابِ چیف الیکشن کمشنر سے جب اس سلسلے میں سوال کیا گیا تھا، تو انہوں نے بڑی سختی سے ارشاد فرمایا "دو فہرستیں تیار کرانے میں خرچ بہت ہوگا" اس پر سائل کی تسلّی نہ ہوئی۔ اس نے دوسرا سوال داغ دیا، اس پر ستار صاحب نے کسی قدر برہمی کے ساتھ فرمایا "میں صرف منصفانہ انتخاب کرانے کا ذمہ دار ہوں"۔

خدا معلوم وہ انتخابات منصفانہ کیونکہ ہوں گے، جن میں ملک کے ایک کروڑ باشندے حصّہ ہی نہ لے سکیں، انہیں یہ خبر ہی نہ ہو کہ ان کا نام فہرست میں درج بھی ہے یا نہیں نہ بنگلہ زبان نہیں آتی تو اس کی سزا انہیں یہ نہیں دی جاسکتی کہ ووٹ کے صحیح اندراج کے لیے سہولتیں مہیا نہ کی جائیں۔ حکام کے ایسے رویّے سے کشیدگی کو فروغ ملتا ہے اور نفرت کے سوا اور کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ اردو فہرستوں پر اگر کچھ خرچ بھی آئے گا، تو اتنا نہیں ہوگا کہ خدانخواستہ ملک کا دیوالیہ نکل جائے (فاضل الیکشن کمشنر نے خرچ کی زیادتی کا اسی انداز میں ذکر فرمایا ہے) اگر صرف کفایت شعاری ہی مقصود ہے، تو اس کے لیے کل یہ تجویز بھی پیش کی جاسکتی ہے کہ انتخاب کا سارا دھندا ہی ختم کردیجیے، لاکھوں کی بچت ہوجائے گی۔ جانے الیکشن کمیشن کو مد بچت بڑھاؤ مہم چلانے کا مشورہ کس نے دیا ہے۔؟ خدا معلوم یہ بات کیوں نظر انداز کردی جاتی ہے، کہ ملکی یک جہتی، جمہوری حکومت کا قیام، اور شہری کو منصفانہ طور پر ووٹ استعمال کرنے کا موقع دینا، ہمارے معاشرے میں سکون اور اطمینان کی فضا بحال کرنے کے لیے ضروری ہے۔ اس پر اگر کروڑوں روپے بھی زائد خرچ ہوجائیں تو وہ غیر ضروری خرچ میں شمار نہیں ہوسکتے۔

سیاسی جماعتیں

"لندن کانفرنس"

پاکستان کی سیاسی جماعتیں داخلی سے زیادہ خارجی "ماحول" میں دلچسپی لے رہی ہیں۔ اس کا ثبوت مختلف جماعتوں کے رہنماؤں کے بیرونی دوروں سے ملتا ہے۔ آجکل لندن پاکستانی سیاسی سرگرمیوں کا مرکز بنا ہوا ہے۔ پیپلز پارٹی کے چیئرمین جناب ذوالفقار علی بھٹو، کونسل مسلم لیگ کے صدر جناب میاں ممتاز دولتانہ، نیشنل عوامی پارٹی کے جناب مسیح الرحمٰن لندن میں ہیں۔ جناب بھاشانی اور شیخ مجیب الرحمٰن بھی لندن جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ جب قارئین یہ سطور پڑھیں گے امید ہے اسوقت شیخ صاحب لندن میں ہونگے کنونشن مسلم لیگ کے "افراہی صدر" راجہ محمود آباد اور حضرتِ سکندر مرزا کا تو مستقل ٹھکانہ ہی اس دیس میں ہے۔ ایک خبر رساں ایجنسی نے اطلاع دی ہے کہ لندن میں موجود رہنما ایک دوسرے سے صلاح مشورہ کررہے ہیں اور آئینی مسائل کی گتھیاں سلجھانے کی تدبیریں سوچ رہے ہیں۔ شیخ مجیب اور بھاشانی بھی اس "غیر رسمی کانفرنس" میں شریک ہوجائیں گے۔ چودھری محمد علی اگرچہ کئی دنوں سے لندن میں تھے، مگر وہ اس جھگڑے سے پیشتر ہی دیارِ حبیبؐ جا پہنچے۔ لندن میں پاکستانی رہنماؤں کی اس کھسر پھسر پر جناب عبدالباقی بلوچ کو بہت تاؤ آیا۔ انہوں نے بیان جاری کردیا کہ "ہمارے رہنماؤں کی لندن میں یہ بیٹھک محبِ وطن پاکستانیوں کے دلوں میں تشویش پیدا کررہی ہے۔"

لندن میں یہ آئینی صلاح مشورے کوئی نئی بات نہیں۔ قیامِ پاکستان سے پیشتر بھی ہندوستانی رہنماؤں کی بہت سی کانفرنسیں وہاں ہوتی رہی ہیں۔ اس لحاظ سے آئینی مسائل پر لندن میں غور کرنا تاریخی تسلسل کو قائم رکھنا ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ اس وقت ہم غلام تھے، آج آزاد ہیں، مگر یہ سب "فروعی" امور ہیں۔ اصل بات تو ہمارے قابلِ قدر قائدین کی پسند یدگی ہے، اگر انہیں لندن کی دنیا اور وہاں کے لوگ پسند ہیں، اگر ان میں سے بعض یہ محسوس کرتے ہیں کہ اپنے مخصوص ذہنی اور سیاسی پس منظر کی وجہ سے تاجِ برطانیہ کے سائے میں گفت گو کرنا کارِ ثواب ہے، تو پھر اس میں اعتراض کی کیا گنجائش ہے؟ ہوسکتا ہے اس طرح زیادہ مثبت نتائج برآمد ہونے کی توقع ہو۔ جناب بھٹو اپنے پرانے کرم فرما جناب سکندر مرزا سے بھی ملے ہیں۔ شاعر نے شاید اسی موقعے کے لیے کہا تھا ؎

اے دوست! کسی ہمدمِ دیرینہ کا ملنا
بہتر ہے ملاقاتِ مسیحا و خضر سے ...

عالمی امور

ماسکو

سٹالن پر نظرِ کرم

کمونسٹ دنیا کے انداز بھی نرالے ہیں، برسرِ اقتدار گروہ جسے چاہے "خادمِ ملت" قرار دے اور جسے چاہے "غدار" کہہ کر پھانسی پر چڑھا دے۔ لیو شاؤچی جو کئی برس تک عوامی جمہوریہ چین کا صدر رہا، اسے اب وہاں جن خطابوں سے نوازا جا رہا ہے، اس کی تفصیل سب کو معلوم ہے۔ وہ بے چارا "ملعون"، "بھا غدار"، "کتا" اور "بھیڑیا" سب کچھ ہے۔ جنابِ سٹالن کے بارے میں روس میں جو کچھ ہوا، وہ بھی بہت دلچسپ ہے۔ جنابِ خروشیف وزیرِ اعظم ہوئے، تو اس آنجہانی رہنما کے خلاف طوفان اٹھ کھڑا ہوا جو زندگی میں "کمونزم کا عظیم رہنما" تھا مرنے کے بعد منافق ٹھہرا، خود اسی کے ساتھیوں نے اسے دنیا بھر میں رسوا کیا، خروشیف تشریف لے گئے تو سٹالن کے بارے میں جذبات خاصے دھیمے پڑ گئے۔

اب اس دھیمے پن کا ایک دستاویزی ثبوت منظرِ عام پر آیا ہے۔ روسی کمونسٹ پارٹی کی طرف سے "جماعت کی تاریخ کے مختصر اسباق" کا تیسرا ایڈیشن شائع کیا گیا ہے اس میں بڑے پیمانے پر تبدیلیاں ہوئی ہیں، سٹالن پر لگائے جانے والے کئی الزامات جنہیں دوسرے ایڈیشن میں خوب وضاحت سے بیان کیا گیا تھا، نئے ایڈیشن میں نظر نہیں آتے۔ اس کے برعکس سٹالن کی خفیہ پولیس کے سربراہ، عالمی کمونسٹ تحریک کے ایک سرکردہ رہنما بیریا کو "بڑے بدمعاش" کے روپ میں پیش کیا گیا ہے۔ خروشیف کے وہ جملے اور تقریریں جو سٹالن کی عظمت کی نفی کرتی تھیں، غائب کر دی گئی ہیں، بلکہ بہت سے معاملات میں سٹالن کی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کی سب سے دلچسپ مثال کیروف کے قتل کی کہانی ہے۔ کیروف روسی کمونسٹ پارٹی کا بہت مقتدر رہنما تھا، اسے ۱۹۳۴ء میں لینن گراڈ میں قتل کر دیا گیا تھا اس قتل پر پارٹی میں بڑی بے چینی پیدا ہوئی۔ خروشیف کے نزدیک سٹالن اپنے مخالفین کو اس قسم کے حربوں سے ختم کرنے کا قائل تھا۔ کیروف کے قتل سے ایک ایسے باب کا آغاز ہوا، جو تشدد اور قتل و غارت کے کئی واقعات سمیٹے ہوئے ہے۔ خروشیف کا کہنا تھا کہ کیروف کے قتل سے جو شبہات پیدا ہوئے وہ ابھی تک دور نہیں ہو سکے۔ یہ سب تفصیلات مذکورہ بالا کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں موجود تھیں، مگر اب کہیں نظر نہیں آتیں، بلکہ اس معاملے میں سٹالن کی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور یہ تاثر دیا گیا ہے کہ اس قتل سے اشتراکیت دشمن طاقتوں کی موجودگی کا احساس ہوا اور یوں پارٹی کے اندر اتحاد کی ایک نئی لہر پیدا ہو گئی۔ یہ گویا کیروف کے قتل کا "مثبت" نتیجہ تھا۔

سٹالن پر سب سے بڑا الزام یہ ہے کہ اس نے ہٹلر کا مقابلہ کرنے کی تیاری نہیں کی تھی۔ اس سلسلے میں بھی پرانے ایڈیشن میں خاصی بحث کرتے ہوئے ذمہ داری سٹالن کے سر ڈال دی گئی تھی، لیکن اب یہ الزام غائب ہے اور اس قصے کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے کہ سٹالن ہٹلر کو کوئی ایسا بہانہ نہیں دینا چاہتا تھا، جس کا سہارا لے کر وہ روس پر چڑھ دوڑے، اگر سٹالن تیاری شروع کرتا، تو ہٹلر کو خبر ہو جاتی اور وہ روس پر چڑھ دوڑتا۔ اس بات کو ذہن میں رکھ کر سٹالن نے ہٹلر کے خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے کسی تیاری کی ضرورت محسوس نہ کی — بیریا کو خوب جی کر کوسا گیا ہے۔ نیا ایڈیشن بتاتا ہے: "بیریا صاحب اپنے محکمے کے معاملات میں وزراء یا پارٹی کی مرکزی کمیٹی کی مداخلت پسند نہیں کرتے تھے اس لیے اُن جناب نے اپنے اعتماد کے آدمی اس محکمے کے بڑے بڑے عہدوں پر فائز کر رکھے تھے۔ انہوں نے "ریاست کے اندر ریاست" بنا ڈالی تھی، بیریا نے پارٹی کو یہ سیاسی سبق سکھا دیا کہ تمام انتظامی محکمے حکومت اور پارٹی کے براہِ راست کنٹرول میں ہونے چاہئیں تاکہ پھر کوئی اور بیریا جنم نہ لے سکے۔"

چین کے بارے میں محض واقعاتی تفصیلات درج ہیں۔ چیئرمین ماؤ کی شان میں جو "ہجویہ پیراگراف" پہلے ایڈیشن میں موجود تھے، نکال دیے گئے ہیں۔ یوگوسلاویہ کے بارے میں بھی لہجہ نرم ہو گیا ہے۔ البتہ خروشیف کی پالیسیوں پر تنقید ضرور موجود ہے، حیرت انگیز امر یہ ہے کہ اس کتاب میں چیکوسلواکیہ کے واقعات کا ذکر تک نہیں کیا گیا۔ جب کہ اس سال جون میں ہونے والی "بین الاقوامی کمونسٹ کانفرنس" کا تذکرہ موجود ہے۔

سٹالن اور بیریا دونوں میں سے کون اچھا تھا اور کون برا، یا دونوں برے تھے، سرِدست ہمیں اس سے غرض نہیں، روس کی کمونسٹ پارٹی جس کو چاہے نوازدے، البتہ جنابِ بیریا کی روح سے ہمدردی ضرور ہے، مگر اسے پریشان ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔ چوتھا ایڈیشن شائع ہونے تک شاید اس کے بھی درجات بلند ہو چکے ہوں۔

اسرائیل

امریکی سپاہی، امریکی اسلحہ

اسرائیل کی جملہ جنگی ضروریات پورا کرنا امریکہ نے اپنے ذمے لے لیا ہے اور جنگی ضروریات میں صرف ہتھیار نہیں ہتھیار چلانے والے سپاہی اور افسر بھی شامل ہیں۔ اسرائیل کو پہلے جرمنی اور فرانس کے ذریعے ہتھیار فراہم کیے جاتے تھے۔ بعد میں یہ انتظامات ناکافی ثابت ہوئے، تو امریکہ نے جدید ترین فینٹم طیاروں سمیت ہر طرح کا اسلحہ براہِ راست فراہم کرنا شروع کیا۔ اب حالات کے رُخ سے ایک اور پردہ اٹھا ہے۔ پچھلے ہفتے اسرائیل میں امریکی سفارت خانے کی طرف سے اعلان ہوا کہ اگر امریکی باشندے اسرائیلی فوج میں بھرتی ہونا چاہیں تو ان کی امریکی شہریت کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ اسرائیلی اخبارات نے اس خبر کو خوب اچھالا۔ عین اس موقع پر عرب چھاپہ ماروں نے اسرائیلی فوج میں کچھ امریکی شہریوں کا سراغ لگایا۔ اس پر عرب ممالک میں سخت ردِعمل ہوا۔ مشترکہ احتجاج کے لیے عرب وزرائے خارجہ کا اجلاس بلایا گیا۔ متحدہ عرب جمہوریہ نے او تھانٹ کے نام احتجاجی مراسلہ روانہ کیا۔ امریکی مندوب مسٹر چارلس یوسٹ نے اپنے جوابی مراسلے میں اس بات کی تردید کی کہ امریکی حکومت اسرائیلی فوج میں بھرتی ہونے کی حوصلہ افزائی کرتی ہے، لیکن وہ اس سے انکار نہ کر سکے کہ امریکی باشندے اسرائیلی فوج میں شامل ہیں۔ انہوں نے صفائی پیش کی کہ ایسے لوگ بیک وقت اسرائیلی اور امریکی شہریت کے حامل ہیں۔ نیز ان کی تعداد بھی بہت معمولی ہے۔ اس اعتراف کی بنیاد پر عرب ملکوں نے اقوامِ متحدہ سے دوبارہ احتجاج کیا۔ بہرحال اس تمام قصے سے امریکہ کے وقار کو سخت ٹھیس پہنچی۔

اس مسئلے سے دنیا کی توجہ ہٹانے کے لیے مغربی پریس نے مخصوص ہتھکنڈے استعمال کیے۔ امریکی پریس نے حکومتِ امریکہ کی تردید شائع کی اور اس کے ساتھ ہی ساتھ عرب احتجاج کو خود ساختہ سیکنڈل ثابت کرنے کے لیے کئی قسم

کی تاویلیں اختراع کیں۔ انٹرنیشنل ہیرلڈ ٹریبیون نے لکھا:
"امورِ عرب کے ماہرین کہتے ہیں: مصر اسرائیل کے ساتھ بات چیت کے بارے میں جس تردّد کا شکار ہے' اس پر پردہ ڈالنے کے لیے یہ سٹنٹ کھڑا کیا گیا ہے۔"

بعض اخبارات نے لکھا ہے: اس کا مقصد اسرائیلی حملوں کے بھاری نقصان کو چھپانا ہے۔ عوام کو یہ تاثر دیا جارہا ہے کہ یہ نقصان پہنچانا اکیلے اسرائیل کے بس کی بات نہیں' امریکہ کے آدمی ہی ایسی کارروائیاں کر سکتے ہیں۔

برطانوی اخبارات نے اس مسئلے پر کوئی خبر نہیں چھاپی البتہ عرب ممالک کو اس واقعے سے جو اخلاقی برتری حاصل ہوئی، اس کا اثر زائل کرنے، بلکہ مختلف حیلوں بہانوں سے امریکہ کی برتری کا ڈھنڈورا پیٹنے کی کوشش کی۔ مثلاً ڈیلی ٹیلیگراف نے جلی سرخی لگائی؛

"امریکہ نے مصر کی درخواست برائے امن کو بلائے استحقار سے ٹھکرا دیا۔"

خبر یہ دی گئی کہ مصر نے امریکہ کی خدمت میں بات چیت کے لیے "رہوڈز فارمولا اختیار کرنے کی درخواست کی تھی" لیکن امریکی حکومت نے یہ درخواست مسترد کر دی۔

مغربی پریس کی یہ حرکتیں اصل حقائق کی پردہ پوشی نہیں کر سکتیں۔ عرب اخبارات کا یہ تاثر کہ امریکہ اسرائیل کے لیے فوجی بھرتی کے مرکز کی حیثیت رکھتا ہے' دنیا کے بہت سے حلقوں کے نزدیک خاصا وزنی ہے۔ امریکہ میں اسرائیل کے لیے بھرتی کا کام نقلِ وطن کے عنوان سے سرانجام پاتا ہے۔ ۱۹۶۷ء کی جنگ کے بعد اسرائیل کی فوجی ضروریات میں بہت اضافہ ہوگیا ــــ اس لیے امریکہ میں بھرتی کا یہ نیا انداز اختیار کیا گیا ہے۔ امریکہ کے اپنے شائع کردہ اعداد و شمار کے مطابق ۱۹۴۸ء سے ۱۹۶۷ء تک اسرائیل پہنچنے والے یہودیوں میں سے صرف ایک فیصد امریکی ہوا کرتے تھے۔ اب کم از کم ۱۲ فیصد یہودی امریکہ سے آتے ہیں۔ اس سال ۵ ہزار امریکی باشندے اسرائیل پہنچیں گے۔ مسز گولڈا میئر نے اپنے حالیہ دورے میں اس بات پر خاص زور دیا کہ زیادہ سے زیادہ امریکی اسرائیل پہنچیں۔ امریکی پریس نے اسرائیل کی شہریت اختیار کرنے کے حق میں زبردست مہم چلا رکھی ہے۔ اسرائیلی زندگی کی دلفریبی اور مقصدیت کا پروپیگنڈا زوروں پر ہے۔ کہا یہی جاتا ہے کہ امریکی باشندے امریکی شہریوں کی حیثیت سے اسرائیل میں رہتے اور فوجی خدمات سرانجام دیتے ہیں۔ جب ان کا کام ختم ہو جاتا ہے تو امریکہ واپس چلے جاتے ہیں۔ اب تک آدھے سے زیادہ امریکی اپنے فرائض خوش اسلوبی سے ادا کر کے واپس امریکہ پہنچ چکے ہیں۔

صومالیہ

فوج، کانِ نمک میں

پچھلے کئی دنوں سے ننھا سا صومالیہ خبروں کا "موضوع" بنا ہوا ہے۔ پہلے صومالیہ کے صدر جناب عبدالرشید شیرمارکے کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ اب فوج نے افسروں کو ساتھ ملا کر اپنی ہی مملکت کو "فتح" کر لیا ہے۔ پارلیمان توڑ کر آئین منسوخ کر دیا گیا ہے۔ تمام مقتدر سیاسی رہنما گرفتار کیے جا چکے ہیں۔ انقلاب کے سربراہ فوج کے کمانڈر انچیف جنرل محمد نفاد ہیں۔ انقلابی کونسل نے اعلان کیا ہے کہ وہ عبدالرشید مرحوم کی پالیسیوں پر عمل کرے گی۔ اس انقلاب کی حقیقی وجوہات تو ابھی تک منظرِ عام پر نہیں آسکیں، تاہم صومالیہ کے حالات کے پیشِ نظر یہ غیر متوقع نہیں تھا۔ بیس لاکھ کی آبادی کے اس ملک میں ۶۲ سیاسی جماعتیں تھیں۔ اسی سے سیاسی خلفشار کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ایتھوپیا اور کینیا جیسی غیر مسلم ریاستوں کے ساتھ جغرافیائی وابستگی رکھنے والی اس مملکت کے ایک حصے پر ابھی تک فرانس قابض ہے۔ صومالیہ کی موجودہ مملکت ان حصوں پر مشتمل ہے، جن پر اٹلی اور برطانیہ کا قبضہ تھا۔ یکم جولائی ۱۹۶۰ء کو ان دونوں علاقوں کے متحد ہونے سے جمہوریہ صومالیہ نے جنم لیا۔ صومالی حکومت فرانس کے تسلط سے اپنے علاقوں کو آزاد کرانے کے لیے مصروفِ جہد تھی، اس کے ساتھ ساتھ داخلی محاذ پر معاشی بدحالی سے مقابلہ درپیش تھا۔ عبدالرشید شیرمارکے مرحوم کی متوازن پالیسیوں کے باعث مغربی اور مشرقی یورپ دونوں سے صومالیہ کو اقتصادی امداد مل رہی تھی۔ لیکن سیاسی اور گروہی طبقوں نے اس مملکت کی نیّا کو منجدھار میں

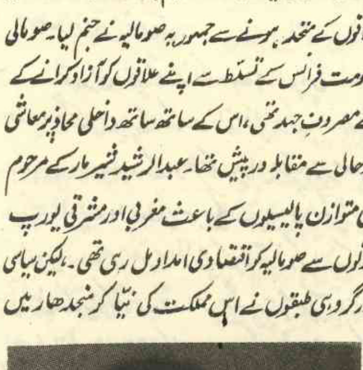

صومالیہ کے مقتول صدر عبدالرشید شیرمارکے

لا پھنسایا تھا۔ فوجی انقلاب اسے ساحل تک پہنچانے کا ارادہ رکھتا ہے یا نہیں، اس سوال کے جواب سے ہی انقلابی حکومت کی نیک نیتی کا اندازہ لگایا جا سکے گا۔ ترقی پذیر ممالک میں فوج کا اثر و رسوخ سیاسی میدان میں بہت بڑھ گیا ہے، لیکن ابھی تک اس کے مثبت نتائج کہیں بھی سامنے نہیں آئے۔ سیاست کے کانِ نمک میں جا کر فوجی افسران بھی "نمک" بن جاتے ہیں۔ ملک دفاعی معاملات میں کمزور ہو کر رہ جاتا ہے، مگر داخلی دنیا میں استحکام کے آثار نظر نہیں آتے۔ صومالیہ جیسا چھوٹا ملک پہلے بھی سیاسی انتشار کی گرداب میں تھا۔ سیاست دانوں نے نفسا نفسی کا کھیل رچا رکھا تھا، اب فوج بھی اس میں شریک ہوگئی ہے۔ اگر فوجی ہائی کمان نے نمائندہ حکومت قائم کرنے کے بعد رخصت ہونے کا منصوبہ نہ بنایا، تو پھر دشمنوں میں گھرے ہوئے اس ملک پر کیا بیتے گی؟ ــ اس بارے میں سرِدست کچھ کہنا ممکن نہیں ــ!

یوگوسلاویہ

ہاتھی کے دانت

گذشتہ ہفتے کے دوران بلغراد میں دنیا کے بڑے بڑے یہودی رہنما اکٹھے ہوئے، یہ حضرات مغربی اور مشرقی یورپ اور اسرائیل سے وارد ہوئے تھے۔ ان میں ہنگری کے ربی اعظم، پولینڈ، چیکوسلواکیہ اور رومانیہ کی یہودی برادری کے نمائندے، عالمی یہود کانگرس کے صدر ڈاکٹر ناہم گولڈمین اور برطانوی یہودیوں کے مقتدر رہنما ایلڈرمین ایم فلڈر شامل ہیں۔ بلغراد میں ان کا بڑا پرتپاک استقبال کیا گیا۔ یوگوسلاویہ کی حکومت کی طرف سے ان کے اعزاز میں عشائیہ دیا گیا۔ یہ سب لوگ یوگوسلاویہ کی یہودی برادریوں کی وفاقی تنظیم کی پندرھویں سالگرہ کا جشن منانے کے لیے جمع ہوئے تھے۔ گذشتہ عرب اسرائیل جنگ کے بعد بلغراد میں منعقد ہونے والا یہ پہلا یہودی اجتماع تھا۔

اس جشنِ عظیم پر بین الاقوامی حلقوں کو بڑی حیرت ہوئی، کیونکہ یوگوسلاویہ کے سفارتی تعلقات اسرائیل سے منقطع ہیں، پھر جنابِ مارشل ٹیٹو، صدر جمال عبدالناصر کے ذاتی دوست بھی ہیں، اس پس منظر کو مدِنظر رکھتے ہوئے اس یہودی اجتماع پر حیرانی ہونی ہی چاہیے، لیکن اس بات کو شاید بین الاقوامی حلقوں نے پیشِ نظر نہیں رکھا کہ یوگوسلاویہ کی یہودی برادری متواتر اسرائیلی رہنماؤں سے رابطہ استوار کیے رہتی ہے، رہا یہ سوال

کہ مارشل ٹیٹو صاحب نے اس کی اجازت کیوں دے رکھی ہے؟ اس کا جواب ہاتھی کے دانتوں سے پوچھیے۔

لبنان

عرب مجاہدین کی گوشمالی

عرب چھاپہ ماروں سے لبنانی فوج کی لڑائی اور شہریوں کی طرف سے چھاپہ ماروں کے حق میں ہڑتالوں اور مظاہروں کی خبریں ساتھ ساتھ آرہی ہیں۔ لبنان منقسم وفاداریوں کا ملک ہے۔ یہاں خواندگی کا تناسب ۸۰٪ ہے پھر بھی عرب قومیت یا اقتصادی مفادات کسی سیاسی وحدت کو جنم دینے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ دستور میں سیاسی توازن مذہبی گروہوں کی بنیاد پر قائم کیا گیا ہے۔

مسلمان کل آبادی کا ۵۷٪ ہیں، لیکن فرانس، امریکہ اور برطانیہ کی سازش سے آبادی کو مسلمان اور عیسائی کے بجائے عیسائی، علوی اور دروزی کے فرقوں میں بانٹا گیا ہے۔ اس تقسیم سے اردنی عیسائی لبنان کا سب سے بڑا فرقہ بن گئے ہیں۔ ۱۹۲۰ء میں لبنان کو مستقل ملک کی حیثیت دینے کا اصل مقصد عیسائی بالادستی کی ایک ریاست قائم کرنا تھا۔ کل ۳۰٪ عیسائیوں کے لیے پارلیمنٹ اور کابینہ میں ۶/۱۱ نشستیں مخصوص ہیں۔ صدر مملکت کے لیے عیسائی ہونا لازمی ہے۔ سب سے عبرت انگیز بات یہ ہے کہ لبنانی جمہوریت کے خالق برطانیہ نے اپنی پارلیمانی روایات کو پسِ پشت ڈال کر یہاں ایک ایسا پارلیمانی نظام قائم کر دیا جس میں عیسائی صدر کو صدارتی نظام سے بھی زیادہ اختیارات حاصل ہیں۔ بظاہر حکومت کا سربراہ وزیر اعظم ہے، لیکن اس کی حیثیت کٹھ پتلی سے زیادہ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۲۶ء سے ۱۹۶۴ء تک اٹھائیس سالوں میں ۴۶ وزارتیں تبدیل ہوئیں۔ اب بھی ملک سیاسی بحران کا شکار ہے۔ انتہائی کوششوں کے باوجود کوئی وزارت قائم نہیں ہو رہی۔ پچھلے کئی ہفتوں سے مستعفی وزیر اعظم رشید کرامی کام کر رہے تھے۔ انہوں نے بھی اس ہفتے کے ہنگاموں میں منصب چھوڑ دیا ہے۔ انہوں نے الزام لگایا ہے کہ چھاپہ ماروں کے خلاف ان کے علم کے بغیر فوجی کارروائی کی گئی ہے۔

اس کارروائی سے عرب ممالک میں لبنان کے خلاف نفرت کی ایک لہر دوڑ گئی ہے۔

شام نے لبنان پر حملہ کرنے کا اعلان کیا ہے۔ اس کا محرک دراصل یہ قدیم دعویٰ ہے کہ لبنان شام کا ایک حصہ ہے جسے فرانسیسی سامراج نے برطانیہ اور امریکہ کے مشورے سے غیر قانونی طور پر الگ کر دیا تھا۔ الجزائر نے لبنان سے سفارتی تعلقات منقطع کر لیے ہیں۔ باقی عرب ممالک نے بھی سخت احتجاج کیا ہے۔

عرب ملکوں کا موقف یہ ہے کہ چھاپہ ماروں کے خلاف فوجی کارروائی امریکہ کے اشارے پر کی گئی ہے۔

لبنان کی عیسائی آبادی اسرائیل کے معاملے میں مسلمانوں کے سے جذبات نہیں رکھتی۔ اگر اختیارات مسلمانوں کے ہاتھ میں ہوتے، تو امریکی دباؤ کے تحت چھاپہ ماروں کو لبنان کی سرزمین استعمال کرنے سے روکا نہ جا سکتا۔

شمالی، جنوبی یمن

خارجہ پالیسی میں تبدیلیاں

شمالی اور جنوبی یمن آجکل عجب بے چینی کا شکار ہیں۔ ایک اطلاع کے مطابق شمالی یمن اپنی خارجہ پالیسی میں تبدیلیوں کا خواہاں ہے۔ اس نے مغربی جرمنی کو تسلیم کر لیا ہے اور مغربی جرمنی نے اُسے اقتصادی امداد اور خوراک فراہم کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ اس نے امریکی حکومت سے تعلقات کے اعادے کی بھی کوشش کی، لیکن امریکہ نے اس کی کچھ "حوصلہ افزائی" نہیں کی۔

شمالی یمن وہ بدقسمت ملک ہے جہاں پانچ سالہ بے مقصد جنگ میں پانچ لاکھ سے زائد افراد ہلاک ہوئے۔ ستمبر ۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۷ء کے اواخر تک یہاں ستر ہزار مصری سپاہی شاہ پسندوں سے برسرپیکار رہے۔ ۱۵ اسکواڈرن رُوسی طیارے بھی مصری افواج کے ساتھ مل کر ان کے "مشن" کی تکمیل کے لیے کوشاں تھے۔ اس جنگ میں مصر دس ہزار مصری پونڈ روزانہ خرچ کرتا رہا۔ اس کی معیشت تباہ ہو کر رہ گئی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ یمن کی معیشت اور معاشرے کا بھی دیوالیہ نکل گیا۔ ستمبر ۱۹۶۷ء کی خرطوم کانفرنس کے بعد جب مصری فوجیں یمن سے نکلیں، تو یہاں غربت و افلاس اور آگ اور خون کے سوا کچھ نہ تھا۔

اب رُوس اور مصر دونوں اسے بے سہارا چھوڑ گئے ہیں، کیونکہ یہاں تیل کی دولت ہے نہ جغرافیائی اہمیت کا کوئی مقام۔ اسے نہایت بے چارگی کی حالت میں جرمنی اور امریکہ کے سامنے دستِ سوال دراز کرنا پڑا، لیکن یہ علاقہ رُوس کے "حلقۂ اثر" میں واقع ہے، اس لیے امریکہ نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا ہے۔

جنوبی یمن کی حالت بھی اس سے مختلف نہیں۔ پچھلے دنوں جنوبی یمن کے وزیر اعظم محمد الہاشم نے کہا کہ وہ مغربی ملکوں کی طرف سے جنوبی یمن میں سرمایہ کاری کا خیر مقدم کریں گے لیکن نظامِ مملکت اشتراکی بنیادوں پر استوار رہے گا۔ اسی سے اس ملک کی اقتصادی بدحالی کا اندازہ لگائیے۔ اہلِ خبر جانتے ہیں کہ ۲۴ رجون ۱۹۶۹ء کو قحطان الشعبی کی برطرفی کے بعد جو حکومت برسراقتدار آئی، وہ انتہا پسند مارکسسٹوں پر مشتمل ہے، لیکن ملکی مالیات کے "استحکام" کا یہ عالم ہے کہ مغربی ملکوں سے سرمایہ کاری کی اپیل کرنی پڑ رہی ہے۔ جنوبی یمن کی اقتصادی حالت خانہ جنگیوں کی زد میں آکر تباہ ہوئی۔ اس پر طرہ یہ کہ آزادی ملتے ہی ساری پرائیویٹ جائیدادوں کو ضبط کر لیا گیا۔ اقتصادی اور معاشرتی ابتری اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔ نہر سویز بند ہو جانے سے عدن کی بندرگاہ سے ہونے والی آمدنی ختم ہو گئی اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ہزاروں مزدور بے کار ہو گئے۔

دانتوں کو کیڑا
لگنے سے بچائیے
آپ بھی
دانتونک ٹوتھ پاؤڈر
سے فائدہ اُٹھائیے
خصوصاً اپنے بچّوں کو
ٹوتھ بُرش کے فیشن کا شکار
ہرگز نہ ہونے دیجئے۔

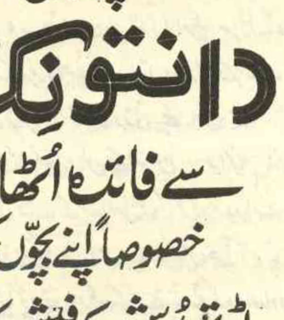

بچّوں کا پسندیدہ — بڑوں کا آزمودہ

DENTONIC
TOOTH POWDER

ٹوتھ پیسٹ سے ہزار درجہ بہتر

چھوٹا سائز	بڑا سائز	فیملی سائز
Rs. 0.90	Rs. 1.60	Rs. 2.70

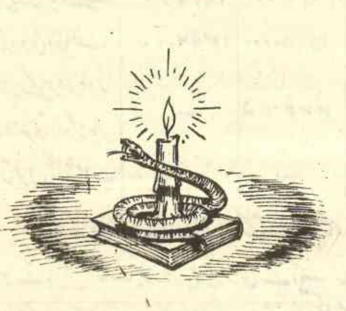

پشاور یونیورسٹی میں مالی خسارے کی رُوداد

الطاف حسن قریشی

سابق صوبہ سرحد کو وسط ایشیا اور شرقِ اوسط میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ اسی اہمیت کے پیشِ نظر جب قائدِ اعظمؒ گورنر جنرل کی حیثیت سے پہلی بار پشاور آئے تو انہوں نے وعدہ فرمایا کہ اس علاقے میں جلد ہی ایک ایسی یونیورسٹی قائم کی جائے گی جو صوبہ سرحد کے علاوہ وسطِ ایشیا کو سیراب کرے گی۔ جنابِ خان عبدالقیوم خاں کے عہدِ وزارتِ عظمیٰ میں پشاور کی عظیم الشان یونیورسٹی تعمیر ہوئی اور اس تعمیر پر خان عبدالقیوم خاں صاحب واقعی فخر کر سکتے ہیں۔

خان لیاقت علی خاں مرحوم نے ۳۰ ر اکتوبر ۱۹۵۰ء کو پشاور یونیورسٹی کا افتتاح کیا۔ جنابِ شیخ تیمور (مرحوم) اس کے پہلے وائس چانسلر اور منہاج الدین پہلے رجسٹرار مقرر ہوئے۔ ان دونوں کلیدی افسروں کی بے پناہ کوششوں سے یونیورسٹی کا مستحکم ڈھانچہ قائم ہوا۔ جنابِ شیخ تیمور نے دیانت اور احساسِ امانت کی لازوال مثالیں قائم کیں۔ وہ اِس بات کی سخت احتیاط کرتے تھے کہ یونیورسٹی کا ایک پیسہ بھی ان کی ذات پر استعمال نہ ہو۔ اُن کے تمام نوکر چاکر، ان کے اپنے ذاتی تھے اور یونیورسٹی کار اور گاڑیاں صرف یونیورسٹی کے کارکنوں کے لیے مخصوص تھیں۔ ان کے بعد ڈاکٹر رضی الدین صدیقی تشریف لائے۔ وہ بھی بڑے دیانت دار اور فرض شناس تھے، مگر سُنا ہے اُن کی اہلیہ یونیورسٹی گاڑیوں کو کبھی کبھی گھریلو کاموں کے لیے بھی استعمال کر لیتی تھیں۔ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی کے عہد میں حیدر آباد دکن کے اربابِ علم و فضل پشاور یونیورسٹی میں کثرت سے آئے۔ ڈاکٹر صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے روپے پیسے پر کڑی نظر رکھی اور یونیورسٹی کے مالیات کو اس قدر مستحکم کیا کہ بینک میں تقریباً ایک کروڑ کے لگ بھگ رقم جمع تھی۔

کرنل آفریدی بڑے کامیاب وائس چانسلر تھے۔ قدرت نے انہیں دل و دماغ کی نہایت عمدہ صلاحیتیں عطا کی تھیں۔ طلبہ کے بہی خواہ، مقصد کے نگراں، اور ایک سحر آفریں مقرر۔ ان کے عہد میں یونیورسٹی نے خوب ترقی کی، مگر ان سے یہ روایت وابستہ ہوگئی کہ وہ سال میں نو ماہ پاکستان سے باہر رہتے تھے۔ اُن کی غیر حاضری میں نظم و نسق کا ڈھیلا پڑ جانا کچھ غیر فطری نہ تھا۔

ان کے بعد چودھری محمد علی تشریف لائے۔ اُنہیں صدر ایوب اور گورنر امیر محمد خاں کی زبردست حمایت حاصل تھی۔ اسی حمایت کے سہارے جہاں انہوں نے یونیورسٹی کی عمارتوں میں بیش بہا اضافہ کیا، وہاں یونیورسٹی کا علمی قد کاٹھ بونا ہوتا چلا گیا۔ وہ چھ سات سال کے لگ بھگ پشاور یونیورسٹی کے سیاہ و سفید کے مالک رہے اور یونیورسٹی کو جس مقام پر چھوڑ گئے، وہ مقامِ حیرت و عبرت ہے۔ ہم اُن کے عظیم الشان کارنامے ذرا تفصیل سے بیان کرتے ہیں:

چودھری صاحب کے عظیم منصوبے کیا تھے، اُن پر علیحدہ بحث ہو گی، لیکن یہ عظیم منصوبے یونیورسٹی کے مالیات کو تباہ و برباد کر گئے اور یونیورسٹی کی وہ تمام سرگرمیاں جن کی بدولت کسی ادارے کو یونیورسٹی کہا جاتا ہے، یکسر ختم ہو گئیں۔ لائبریری یونیورسٹی کی زندگی میں آکسیجن کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر طلبہ اور اساتذہ کو تازہ ترین کتابیں اور رسالے پڑھنے کو نہ ملیں، تو ان کا علم باسی ہو جاتا ہے۔ گذشتہ تین برسوں میں کتابوں اور رسالوں کی خرید پر جو رقمیں بجٹ میں مخصوص ہوئیں، وہ یہ تھیں:

اخراجات کی مدیں	۶۵ - ۶۶ء	۶۶ - ۶۷ء	۶۸ - ۶۹ء (تخمینہ)
کتابوں اور رسالوں کی خرید	۱۵۱۷٫۱۶	- -	- -
کتابوں کے قیمتی ذخائر		- -	- -
جلد سازی اور لائبریری کی ضروریات	۱۸۱۰٫۹۵	۱۷۶۵٫۲۲	۱۸۰۰

۶۸-۶۹ کے تخمینے میں کتابوں کی خرید کے لیے ایک لاکھ روپے خصوصی مد میں رکھے گئے تھے، مگر یہ یونیورسٹی کے بڑھتے ہوئے خسارے کی نذر ہو گئے۔

یونیورسٹی کا مقصدِ وجود تحقیق (ریسرچ) کو فروغ دینا ہے۔ تحقیق پر گذشتہ تین چار برس میں کیا بیتی، اس کی روداد بھی اعداد و شمار کی زبانی سُن لیجیے — اصلاحِ تعلیم

(IMPROVEMENT OF EDUCATION) کے زیرِ عنوان تحقیق کے لیے حسب ذیل رقمیں مخصوص کی گئیں:

اخراجات کی رقمیں	۶۵ - ۶۶ء	۶۶ - ۶۷ء	۶۷ - ۶۸ء	۶۸ - ۶۹ء تخمینہ
تحقیقی کام	۲۱۷۰٫۰۶	—	—	—
غیر ملکی وظیفے	۹۱۵۱۸٫۳۰	۲۰۴۰۱-۶۵	-	۲۲۰۰۰
یونیورسٹی امتیازی وظیفے	۲۷۲۵٫۰۰	۲۶۴۵٫۰۰	۲۵۰۰۰	
اندرونی وظائف	۱۳۹۶۰٫۰۰	۱۵۷۵۰٫۰۰	—	—
طلبہ کے جرائد اور دوسری سرگرمیاں	—	۳۳۲٫۷۵	۱۵۰۰٫۰۰	—
کتابوں کی اشاعت	—	—	—	—

ان اعداد و شمار سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ پشاور یونیورسٹی میں تحقیقی کام کے سوتے بالکل خشک ہو گئے۔ یونیورسٹی نے ایک کتاب بھی شائع نہ کی۔ طلبہ کے وظائف ہر سال کم ہوتے چلے گئے اور اُن کی تخلیقی اور عقلی سرگرمیاں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ اس کے علاوہ خیبر میڈیکل کالج، زرعی کالج اور انجینئرنگ کالج کی لیبارٹریوں میں ایک مدت سے نئے آلات اور نئی مشینوں کا اضافہ نہ ہوا — ان کالجوں کے طلبہ نے بتایا: آلات اس قدر پرانے ہیں کہ ان کے ذریعے سائنسی یا تکنیکی میدانوں میں کچھ بھی نہیں کیا جا سکتا یہی وجہ ہے کہ ان کالجوں سے فارغ ہونے والے عملی میدان میں بہت پیچھے رہ جاتے ہیں اور وہ اپنے علاقے اور اپنے ملک کی وہ خدمت انجام نہیں دے سکتے جن کی صلاحیت ان کے اندر موجود ہے۔ یونیورسٹی کے چار برسوں کے بجٹ میں سائنسی اپریٹس خریدنے کے لیے ایک پیسہ بھی مخصوص نہیں کیا گیا۔ یونیورسٹی کی لیبارٹریوں کے لیے سال بھر میں صرف چھ ہزار کی رقم مختص کی گئی ہے۔ یہ رقم تنخواہوں پر خرچ ہو جاتی ہو گی۔ یہاں یہ بات پیش نظر رہے کہ یونیورسٹی کے لانز کی دیکھ بھال پر ہر سال پینتالیس ہزار کے لگ بھگ رقم اُٹھ جاتی ہے۔ کیا ہم اسے یونیورسٹی کا علمی دیوالیہ پن نہیں کہہ سکتے؟ دراصل چودھری محمد علی صاحب کو اس بات کی بہت کم فکر تھی کہ یونیورسٹی کیسے طلبہ پیدا کر رہی ہے اور وہ اس میں زیادہ دلچسپی لیتے تھے کہ ان کی شخصیت کی بلندی میں پروپیگنڈے نے کس قدر اضافہ کیا ہے۔

فطری طور پر یہ سوال ابھرتا ہے کہ جب یونیورسٹی کی حقیقی قدر و قیمت میں کوئی اضافہ نہیں ہوا، تو پھر یونیورسٹی کے مالیات تباہ کیوں ہوئے؟ اس کی زیادہ تر ذمہ داری جناب ایم شریف (سابق مرکزی سیکرٹری تعلیم) اور چودھری محمد علی (سابق وائس چانسلر) پر عائد ہوتی ہے۔ ایوب خاں صاحب کی یہ ادا سب کو معلوم ہے کہ وہ جس شخص سے متاثر ہو جاتے تھے، اسے سیاہ و سفید کا مالک بنا دیتے تھے۔ شریف صاحب نے انہیں صدر پاکستان بننے سے پہلے ہی متاثر کر رکھا تھا۔ انہیں تعلیمی امور سے دور کا بھی تعلق نہ تھا، مگر ایوب خاں نے تعلیمی حکمتِ عملی ان کے سپرد کر دی۔ شریف صاحب خود بھی آمرانہ مزاج رکھتے تھے اور ادھر صدر صاحب سے کھلی چھٹی مل گئی، تو انہوں نے ٹیلی فون پر قسمت کے بڑے بڑے فیصلے کر ڈالے۔ وائس چانسلروں کو وہ اس طرح فون کیا کرتے تھے جیسے یونیورسٹیاں ان کی ذاتی جائیداد ہوں۔ ان کی فطرت میں فرعونیت رچی بسی تھی وہ چاہتے تھے قوم کے غریب بچے اعلیٰ مناصب حاصل نہ کر سکیں، چنانچہ ان کے زمانے میں پبلک اسکولوں پر روپیہ پانی کی طرح بہایا گیا۔ پھر ان کے سر میں کالجوں کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کا سودا سمایا۔ یہ سوچے بغیر کہ غریب قوم کالج کو دو عمارتوں میں تقسیم کرنے کے اخراجات برداشت کر سکتی ہے یا نہیں؛ انہوں نے بلا مبالغہ کروڑوں روپے نئی عمارتوں کی تعمیر پر صرف کروا دیے۔ شریف صاحب ہی کے زمانے سے یونیورسٹیوں میں خسارے کی روایت قائم ہوئی۔

چودھری محمد علی اپنا جداطنطنہ رکھتے تھے۔ شریف صاحب کے اشاروں کنایوں پر انہوں نے اپنے اختیارات کا مسند چھایا اور صرف اپنی انا کو تسکین دینے کے لیے ایسے ایسے اقدام کیے جو یونیورسٹی کے لیے خودکشی کی حیثیت رکھتے تھے۔

وائس چانسلری سنبھالنے کے دوسرے ہی سال سے پشاور یونیورسٹی کا خسارہ شروع ہو گیا۔ سال بہ سال خسارے کے اعداد و شمار یہ ہیں:

۶۳-۶۴ء	۶۹۱۴۰۹٫۳۳
۶۴-۶۵ء	۱۶۶۲۱۶۲٫۳۳
۶۵-۶۶ء	۸۵۸۷۴۰٫۰۷
۶۶-۶۷ء	۱۳۵۲۵۷۱٫۲۴
۶۷-۶۸ء	۷۷۵۴۰۳٫۳۸

۶۸-۶۹ء کے تخمینے کے مطابق خسارہ ۶۲ لاکھ ۸ ہزار ۸ سو ۴۳ روپے تک پہنچ گیا — خسارہ اس لیے بڑھتا گیا کہ چودھری صاحب حکومت کی مالیاتی منظوری لیے بغیر یونیورسٹی میں نئے نئے شعبوں کا اضافہ کرتے چلے گئے۔ وہ دکھاوے کے آدمی تھے۔ یونیورسٹی کے شعبوں کو مستحکم کرنے پر توجہ دیتے، تو پبلسٹی کے زیادہ مواقع میسر نہ آ سکتے تھے، چنانچہ انہوں نے تیزی سے نئے نئے شعبے کھولنے شروع کیے۔ ہر نئے شعبے کا افتتاح یا صدر پاکستان کرتے تھے یا گورنر یا طاقتور سیکرٹری۔ ان کا خیال تھا اس طریق کار سے خود بخود حکومت کی گرانٹ مل جائے گی، مگر فنانس ڈیپارٹمنٹ نے تعاون نہ کیا۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ جو نئے شعبے کھولے گئے، وہ افادیت کے اعتبار سے بہت زیادہ ضروری بھی نہ تھے۔ ہم ان شعبوں کا تفصیلی ذکر کرتے ہیں جو حکومت کی گرانٹ کے بغیر مسلسل چلتے رہے:

کالج برائے خواتین

یہ واقعہ ایک سے زیادہ واقفانِ حال نے بتایا کہ اس کالج کے کھلنے کا سب سے بڑا سبب ایک با اثر فرد کی رشتہ دار کو ملازمت دینا تھا۔ وہ خاتون جنہیں کالج کا پرنسپل مقرر کیا گیا، سری نگر یا کسی اور مقام پر ایک سکول میں پڑھاتی تھیں۔ ان کے پاس اس وقت ایم اے کی ڈگری بھی نہ تھی، لیکن انہیں ڈگری کالج کا پرنسپل مقرر کر دیا گیا۔ جس وقت کالج کھلا، فرسٹ ایئر میں اور تھرڈ ایئر میں صرف ۱۴ لڑکیاں تھیں اور انہیں پڑھانے والے اساتذہ ستائیس کے لگ بھگ تھے۔ فرسٹ ایئر اور سیکنڈ ایئر کے لیے ہائر سیکنڈری بورڈ کی منظوری حاصل کرنا ضروری تھا۔ یونیورسٹی نے منظوری کے لیے لکھا، مگر بورڈ نے یہ کہہ کر منظوری دینے سے انکار کر دیا کہ اس کالج کی پرنسپل ایم اے نہیں ہیں۔ یونیورسٹی نے سوچ سوچ کر جواب میں لکھا کہ چونکہ یہ ڈگری کالج ہے، اس لیے بورڈ سے منظوری لینے کی ضرورت نہیں۔

فائن آرٹس

یونیورسٹی کے خسارے میں اضافہ کرنے کے لیے فائن آرٹس کا شعبہ قائم ہوا، پہلے صادقین اس کے سربراہ مقرر ہوئے۔ ان کا مشاہرہ بہت زیادہ

تھا۔ اس شعبے میں طلبہ کی تعداد چار یا پانچ سے زیادہ نہ تھی اور لطف یہ کہ جو ڈپلومہ دیا جاتا ہے اس کی کوئی حیثیت بھی نہیں۔ آج کل اس شعبے پر ۲۳ ہزار روپے سالانہ خرچ ہو رہے ہیں۔

شعبۂ نفسیات

فلسفے اور نفسیات کے شعبے پہلے ایک ہی شعبے میں مدغم تھے۔ وائس چانسلر صاحب، ڈاکٹر ایس ایم معنی کو ڈھاکہ سے گراں قدر مشاہرے پر لائے۔ انہیں ڈھاکہ سے پشاور آنے تک کا کرایہ بھی عطا ہوا۔ اس وقت وہ تقریباً دو ہزار روپے ماہانہ کے وصول کر رہے ہیں۔ پہلے یہ فلسفے کے بھی سربراہ رہے، بعد میں فلسفے کے کسی استاد سے ڈاکٹر معنی کے تعلقات خراب ہو گئے، تو نفسیات اور فلسفے کے دو شعبے قائم ہوئے۔ کچھ عرصے بعد مالی کفایت شعاری کے پیشِ نظر یہ دونوں شعبے یکجا کر دیے گئے، مگر پھر کش مکش شروع ہو گئی، اور یہ دونوں شعبے جدا جدا کر دیے گئے۔ ڈاکٹر معنی صاحب کے آنے سے پہلے فلسفے کے شعبے کے انچارج ۷۰۰ روپے کے گریڈ میں تھے۔

یونیورسٹی مدرسے

پشاور یونیورسٹی چونکہ ایک اقامتی ادارہ ہے، اس لیے بچوں کے لیے اسکولوں کا قائم ہونا ضروری تھا، مگر اس میدان میں بھی چودھری صاحب نے منصوبہ بندی کے بڑے بڑے کمال دکھائے۔ ایک اردو ذریعۂ تعلیم کا اسکول قائم ہوا۔ ساتھ ہی انگریزی ذریعۂ تعلیم کا پبلک اسکول کھول دیا گیا۔ عظیم الشان عمارتوں کے علاوہ ہر اسکول پر لاکھوں روپے خرچ آئے۔ ۶۸-۱۹۶۹ء کا تخمینہ ۶۳,۷۳۹,۱ روپے تھا۔ اس طرح ماڈل اسکول کا سالانہ تخمینہ ۴۳۲,۰۹,۱ روپے ہے۔

چودھری صاحب نے دانستہ یا نادانستہ طور پر ایسے کام کیے جن سے یونیورسٹی والوں نے یہ تاثر لیا کہ وہ اپنے عزیزوں، دوستوں کو قانون کی حدود سے باہر نکل کر نوازتے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

چودھری صاحب کے صاحبزادے داؤد کمال صاحب یونیورسٹی کے انگریزی شعبے میں لیکچرار تھے۔ یونیورسٹی کا قاعدہ یہ ہے کہ ریڈر اس شخص کو بناتے ہیں جو پی ایچ ڈی ہو، یا صلاحیتوں اور مدّتِ ملازمت کے اعتبار سے بہت ممتاز ہو۔ داؤد کمال صاحب کی مدّتِ ملازمت بھی بہت کم تھی اور انہوں نے ڈاکٹریٹ بھی نہیں کیا تھا۔ انہیں وظیفے پر ملک سے باہر بھیجنے کا منصوبہ تیار ہوا اور باہر جانے سے پہلے داؤد کمال ریڈر بنا دیے گئے۔ اس اقدام کا یہ اثر ہوا کہ تمام سینئر لیکچراروں نے یہ مطالبہ کیا کہ ہمیں بھی ریڈر بنایا جائے۔ چودھری صاحب اس مطالبے کو مسترد نہیں کر سکتے تھے؛ چنانچہ کھیپ کی کھیپ ریڈر بن گئی۔

اس کے بعد داؤد کمال صاحب نے لندن سے لکھا کہ انہیں کتابوں کے اخراجات بھی دیے جائیں۔ یونیورسٹی نے ۵۰ پونڈ منظور کر دیے۔ اس روایت کے قائم ہوتے ہی ان تمام اساتذہ نے ۵۰ پونڈ کا مطالبہ کیا، جو ملک سے باہر زیرِ تعلیم تھے اور انہوں نے بھی جو کئی برس پہلے ملک سے باہر گئے تھے۔ اس طرح یونیورسٹی پر ہزاروں پونڈ کا بوجھ پڑا۔ ستم یہ کہ داؤد کمال ڈاکٹریٹ کرنے میں ناکام رہے۔ اس کے باوجود جب وہ واپس تشریف لائے تو انہیں ترقیاں دی گئیں۔

داؤد کمال کے ساتھ ان کی اہلیہ بھی لندن گئی تھیں۔ واپسی پر ان کی ملازمت کا انتظام ہونا چاہیے تھا۔ وائس چانسلر صاحب نے، واقفانِ حال کہتے ہیں، اپنی بہو کو ملازمت دلانے کے لیے یہ قانون منظور کرایا کہ ایم اے کے ہر اس شعبے میں جس میں لڑکیاں پڑھتی ہیں، ایک خاتون لیکچرار ہونی چاہیے؛ چنانچہ اس قانون کے تحت کئی خواتین کو ملازمتیں مل گئیں۔ فارسی کے شعبے میں کوئی لڑکی نہ تھی، وہاں ایک لڑکی داخل کرائی گئی تاکہ ایک خاتون کو استاد کی حیثیت سے رکھا جا سکے۔

چودھری صاحب کی عنایاتِ خسروانہ کی کوئی حد نہ تھی۔ کراچی یونیورسٹی کے ایک استاد انہیں پسند آ گئے۔ وہ اپنے مضمون میں صرف ایم اے تھے۔ معلوم ہوا انہیں بیک وقت سات ترقیاں دی گئیں۔ اور ایسے اساتذہ بھی یونیورسٹی میں موجود ہیں جن کے کام سے خوش ہو کر چودھری صاحب نے ایک سال میں دو دو ترقیاں دیں، لیکن جاتے وقت اُن کے خلاف بُری رپورٹیں لکھیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر ان اساتذہ کا کام اس قدر اچھا تھا کہ انہیں غیرمعمولی ترقیاں دی گئیں، تو ۶۹ء کے شروع میں ان کا کام اتنا خراب کیسے ہو گیا کہ چودھری صاحب بُرے ریمارکس دینے پر مجبور ہو گئے۔ وہ یونیورسٹی کے تمام معاملات اپنی پسند یا ناپسند پر چلاتے تھے اور قواعد و ضوابط کی ذرا پروا نہ کرتے تھے۔

ضیاء الدین رجسٹرار پر چودھری صاحب بڑے مہربان تھے۔ جب وہ ریٹائر ہوئے تو انہیں دوبارہ ملازمت میں پوری تنخواہ پر رکھ لیا اور پنشن بھی دی۔ اس کے علاوہ "معاملاتِ مذاکرہ" کے انچارج کی حیثیت سے انہیں ڈیڑھ سو روپے ماہوار ملتے تھے۔ مذاکرے یونیورسٹی میں سال بھر میں چار پانچ سے زیادہ نہیں ہوتے تھے۔ وہ بورڈ آف ٹرسٹیز کے بھی سیکرٹری تھے، اس بورڈ کی میٹنگ سال بھر میں دو بار سے زیادہ نہ ہوتی تھی، مگر ہر ماہ دو سو روپے اُنہیں مل جاتے تھے۔

آرکیالوجی کے شعبے پر چودھری صاحب نے دل کھول کر روپیہ خرچ کیا۔ پروفیسر دانی یقیناً عالمی شہرت کے پروفیسر ہیں، مگر جب یونیورسٹی کی حالت یہ ہو کہ اس کی تجربہ گاہوں میں نیا سامان نہ ہو، نئی کتابیں نہ ہوں اور خسارے کا بوجھ لحظہ بہ لحظہ بڑھتا جا رہا ہو، تو ایسے میں کھدائیوں پر بے حساب پیسہ خرچ کرنا عقل مندی نہیں۔ یونیورسٹی کے تعلیمی شعبے ۴۲ کے لگ بھگ ہیں۔ اخراجات کے اعتبار سے آرکیالوجی ڈیپارٹمنٹ تیسرے نمبر پر آتا ہے۔ اوپر کے دو شعبے، کیمسٹری اور انگریزی اور یورپین زبانوں کے شعبے ہیں۔ باقاعدہ رقوم کے علاوہ آرکیالوجی ڈیپارٹمنٹ کو ایک سال کے لیے ایک لاکھ بیس ہزار اور ۶۸-۱۹۶۹ء کے تخمینے میں ۸۰ ہزار کی علیحدہ گرانٹ ملی۔

پشاور یونیورسٹی کے انجینئرنگ کالج میں ایسا بھی ہوا کہ ایک صاحب اس میں لیکچرار کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ انہوں نے ملازمت چھوڑ دی اور ملک سے باہر چلے گئے۔ جرمنی سے انہوں نے فوٹوگرافی میں ڈپلوما حاصل کیا۔ اس ڈپلومے کی بنیاد پر انہیں اسی انجینئرنگ کالج میں بڑی شاندار آسامی مل گئی۔

چودھری صاحب چھوٹی چھوٹی باتوں پر بڑے بڑے فیصلے بدل دیتے تھے۔ ایک بار امریکہ سے معاہدہ ہوا جس کے تحت انگریزی زبان پر سیمینار منعقد ہونے تھے۔ چودھری صاحب نے اس معاہدے پر دستخط کیے۔ امریکہ کی طرف سے ۵۹ ہزار روپے کا چیک وصول کر لیا گیا۔ اس معاہدے میں یہ بھی شامل تھا کہ دو امریکی پروفیسر آئیں گے اور سیمینار میں حصّہ لیں گے۔ ادھر سے خطوط آنے شروع ہوئے کہ ہم فلاں فلاں پروفیسر کو بھیجنا چاہتے ہیں۔ پہلا خط آیا، تو چودھری صاحب نے انگریزی شعبے کے سربراہ کو بھیج دیا۔ انہوں نے کہا یہ امریکی ہمیں انگریزی پڑھائیں گے، ان کی تو اپنی انگریزی بڑی خراب ہوتی ہے۔ چودھری صاحب نے لکھ بھیجا ہمیں کسی پروفیسر کی ضرورت نہیں۔ جواب آیا، معاہدے کی رو سے ہمارے دو پروفیسر

ضرور آئیں گے۔

ادھر یہ خط و کتابت ہوتی رہی اور دوسری طرف سیمینار کے تمام انتظامات مکمل ہوگئے۔ دوسری یونیورسٹیوں سے مندوبین آنے لگے۔ امریکی حکومت نے سخت رویّہ اختیار کیا، تو چودھری صاحب نے ۵۹ ہزار روپے کا چیک واپس کردیا اور چونکہ انتظامات ہوچکے تھے، اس لیے یونیورسٹی کے خزانے سے ۵۹ ہزار روپے ادا کرنے پڑے۔

چودھری صاحب ان کاموں پر خاص توجہ دیتے تھے جن سے اخبارات تک پہنچنے کا آسان راستہ میسّر آجائے۔ سوشل ورک پشاور یونیورسٹی کا خاص پروگرام بن گیا۔ کام کرنے کا طریقہ یہ تھا کہ چودھری صاحب طلبہ کو گرمی کی چھٹیوں میں عموماً پہاڑی علاقوں میں لے جاتے تھے جہاں آب و ہوا بہتر ہوتی تھی۔ دوسرے وہ اس بات کا خاص خیال رکھتے تھے کہ صدرِ پاکستان اور گورنر مغربی پاکستان اس سال کس علاقے میں آرام کے لیے جائیں گے۔ ان کے پروگرام کے مطابق سوشل ورک کا پروگرام بدلتا رہتا تھا۔ جدھر سے صدر گزرے، وہ طلبا کا کام دیکھنے کے لیے رُک گئے، تصویریں کھنچیں اور اخبارات میں خبریں چھپ گئیں اور ادھر چودھری صاحب صدرِ پاکستان کے دل میں اور گہرے اتر گئے۔ سوشل ورک پر یونیورسٹی کے اخراجات یہ رہے ہیں:

۱۹۶۴ء - ۶۵ء میں سوشل اور ایجوکیشنل ورک پر مجموعی طور پر پندرہ ہزار کے قریب خرچ ہوئے لیکن ۶۶ - ۱۹۶۵ء میں اخراجات یک لخت ایک لاکھ دس ہزار تک پہنچ گئے۔ خسارے کے شدید دباؤ کے باوجود ۶۹ - ۱۹۶۸ء کا تخمینہ ساٹھ ہزار روپے کا ہے۔ اندازہ ہے اتنی بڑی رقم سے سڑکوں کی تعمیر کا کام دوسرے ذرائع سے چار گنا ہو سکتا تھا۔ سوشل ورک کی جو تفصیلات بتائی جاتی رہی ہیں، ان کے مطابق سابق صوبہ سرحد کی دیہی زندگی میں انقلاب آجانا چاہیے تھا۔ یہ سارے کا سارا انقلاب فقط اخبارات کی فائلوں تک محدود رہا۔

پشاور یونیورسٹی کو پرنس آغا خاں نے آڈیٹوریم بنانے کے لیے تین لاکھ روپے کا عطیہ دیا۔ آڈیٹوریم میں سینما تعمیر کر دیا گیا ہے اور پھر فلموں کے اشتہارات یونیورسٹی کیمپس میں جابجا نظر آتے ہیں۔ اقامتی جامعہ کا سب سے بڑا مقصد طلبہ کو معاشرے کی کثافتوں سے محفوظ رکھ کر ان کی صحت مند ذہنی، اخلاقی اور جسمانی نشوونما ہے۔ سینما کے برے اثرات اگر آپ یونیورسٹی کے اندر لے آئیں اور ہر طالب علم کے لیے معاشرے کی برائیوں کا شکار بن جانا آسان ہو جائے، تو پھر اقامتی جامعہ پر اس قدر روپیہ خرچ کرنے کی کیا ضرورت۔ طلبہ کی اخلاقی صحت کے نگران آڈیٹوریم میں سینما بن جانے پر بہت مضطرب ہیں اور بالخصوص اس بات پر کہ سینما میں سائنسی اور تعلیمی فلموں کے بجائے وہی بازاری فلمیں دکھائی جارہی ہیں جن سے نوجوانوں کے اخلاق بڑی تیزی سے متاثر ہو رہے ہیں۔

چودھری محمد علی جس طرح ان فیاضیوں کے لیے مشہور تھے، اسی طرح وہ جن لوگوں کو پسند نہیں کرتے تھے، ان کو تنگ کرنے میں بھی بڑی شہرت رکھتے تھے۔ کہا جاتا ہے اسلامیہ کالج کے پرنسپل درّانی صاحب سے ان کے تعلقات خوشگوار نہ تھے، اس لیے اسلامیہ کالج چودھری صاحب کے عہدِ اقتدار میں تیزی سے تنزّل کی طرف لڑھکتا رہا۔ لاء کالج میں ایک واقعہ بہت سے پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے۔ واقفانِ حال نے اس واقعے کی حسبِ ذیل کہانی سنائی:

لاء کالج میں بشیر صاحب ریڈر کی حیثیت سے ۱۹۵۵ء میں ملازم ہوئے۔ ان دنوں چودھری محمد علی صاحب سنڈیکیٹ کے ممبر تھے اور لاء کالج کے پرنسپل بننا چاہتے تھے۔ ۱۹۵۶ء میں وہ اعزازی پرنسپل مقرر ہوئے۔ پرنسپل ہونے کے بعد ان کے بشیر صاحب سے تعلقات اچھے نہ رہے۔ یونیورسٹی کے قواعد و ضوابط کے مطابق بشیر صاحب کو دو سال کے بعد یا تو مستقل ہو جانا چاہیے تھا اور اگر کام اچھا نہ تھا، تو چھٹی مل جانی چاہیے تھی، مگر راستہ اس سے بالکل مختلف اختیار کیا گیا۔ بشیر صاحب کی تنخواہ ۶۰۰ روپے ماہوار مقرر کر دی گئی، یعنی انہیں کوئی ترقی نہیں مل سکتی تھی۔ بشیر صاحب نے اس رویے کے خلاف رٹ دائر کر دی۔ اس مقدمے کا فیصلہ غالباً ۶۲ء کے آخر میں ہوا۔ ہائی کورٹ نے فیصلہ دیا کہ بشیر صاحب کو ۵۷ء سے مستقل کر دیا جائے۔ ۶۳ء میں چودھری صاحب وائس چانسلر تھے، انہوں نے ہائی کورٹ کے خلاف، سپریم کورٹ میں اپیل دائر کر دی۔ کون حق پر ہے، اس کا فیصلہ سپریم کورٹ میں ہو جائے گا۔ غور طلب پہلو یہ ہے کہ مقدمات پر یونیورسٹی کے بھاری اخراجات اٹھ رہے ہوں گے۔ اس زمانے میں جب کہ یونیورسٹی پیسے پیسے کو ترس رہی تھی اور چودھری صاحب مختلف احباب پر عنایاتِ خسروانہ فرما رہے تھے، کیا ایسے میں بشیر صاحب کا معاملہ اپنے ہی طور پر طے نہیں کیا جا سکتا تھا؟

چودھری صاحب کو طلبہ میں مقبول ہونے کا بڑا شوق تھا۔ انہوں نے وائس چانسلر فنڈ کے نام پر طلبہ کو وظائف دینے شروع کئے۔ یہ فنڈ انہوں نے کسی کی منظوری کے بغیر خود ہی قائم کر لیا تھا۔ ایک دو سال یہ سلسلہ چلا، بعد میں اس پر سخت اعتراضات ہوئے اور وائس چانسلر صاحب کے لیے اپنے نام سے وظائف دینے کے مواقع بہت کم ہو گئے۔ طلبہ کے لیے وہ کتنا ایثار کر سکتے تھے، اس کا اندازہ ایک واقعے سے کریجئے:

جن دنوں وہ سنڈیکیٹ کے ممبر تھے، انہوں نے طلبہ کے بہبود فنڈ میں ۵۰ روپے عطیے کے طور پر دیے۔ جب وائس چانسلر بنے، تو پوچھا میں نے جو پچاس روپے دیے تھے وہ کہاں خرچ کئے گئے؟ متعلقہ فرد نے جواب دیا: "ابھی تک کہیں خرچ نہیں ہوئے کیونکہ رقم اتنی کم تھی کہ اسے خرچ کرنے کا مناسب موقع نہ ملا۔" وائس چانسلر فرمانے لگے: وہ رقم مجھے واپس کر دیجئے۔

پشاور یونیورسٹی کی داستان بہت طویل ہے، ہم فی الحال اسے یہیں ختم کرتے ہیں، لیکن یہ عرض کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ پشاور یونیورسٹی پورے وسطِ ایشیا میں انفرادی مقام رکھتی ہے۔ کابل میں یونیورسٹی قائم ہے اور وہاں کی حکومت اس کی تعمیر و توسیع پر غیر معمولی توجہ دے رہی ہے۔ پشاور یونیورسٹی کو کابل یونیورسٹی سے بہتر اور مستحکم ہونا چاہیے۔ سابق صوبہ سرحد کے بھائیوں نے جن شدید مخالفتوں کا مقابلہ کیا اور پاکستان کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا، ان کی ترقی اور ان کی نشوونما حکومتِ پاکستان کی ایک بڑی ذمہ داری ہے۔ ہمارے خیال میں پشاور یونیورسٹی کی گرانٹ میں معقول اضافہ ہونا چاہیے تاکہ اس یونیورسٹی سے علم و فن کے سوتے پھوٹتے رہیں اور اس علاقے کے طلبہ اپنی صلاحیتوں کو پوری طرح بروئے کار لا کر پاکستان کی تشکیلِ جدید میں اپنا کردار ادا کرسکیں۔

پشاور یونیورسٹی میں نظریۂ پاکستان پر مستحکم ایمان رکھنے والے بہت بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ اگرچہ بعض عناصر نے پٹھان، پنجابی اور حیدرآبادی کا مسئلہ ابھار رکھا ہے، مگر عظیم اکثریت ہر پاکستانی مسلمان کو اپنا بھائی سمجھتی ہے اور یہی جذبہ اور ولولہ پاکستان کی بنیادوں کو مضبوط کرتا چلا جائے گا۔

چودھری صاحب کے بارے میں ہم نے جو حقائق پیش کئے ہیں، ان کا مقصد شخصیت کو ہدف بنانا ہرگز نہیں۔ ہم تو صرف یہ احساس دلانا چاہتے ہیں کہ یونیورسٹی ایک عوامی ادارہ ہے اور اس کے سربراہ کو عوامی احتساب اور قانون کی حدود اور ملک کے اعلیٰ مقاصد کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔ اسلامی معاشرے کی عظمت و انفرادیت کے متعلق زبانی باتیں بہت ہو چکیں، اب ہمیں یہ ثابت کرنا ہے کہ مسلمان، ذمے داریاں سنبھال لینے کے بعد، میزانِ عدل قائم کر سکتا ہے اور حق و انصاف کے نفاذ میں، اس کی خواہش اور رشتہ داروں کی مصلحتیں حائل نہیں ہوں گی۔

محکمہ سیاحت کے سیاہ اور سفید کارنامے

خاصا عرصہ پہلے پچاس ہزار روپے کی رقم سے رنگا متی، کاکسس بازار اور مولوی بازار میں تین قبائلی طائفے ترتیب دیئے گئے۔ اس رقم کا زیادہ تر حصہ ان طائفوں کی تنخواہوں پر خرچ ہوگیا، لیکن آج تک یہ طائفے اپنے "فن" کا ایک مظاہرہ بھی نہیں کر سکے۔

نجم الحسن۔ کراچی

چند روز ہوئے ایک چیکوسلاویکی اخبار نویس دو تین دن کے لیے کراچی ٹھہرا۔ مجھے اس سے ملنے کا اتفاق ہوا، تو اس نے کراچی کی سیر گاہوں کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ کراچی کی تفریح گاہوں کی سیر کے سلسلے میں محکمۂ سیاحت کے اشتہار میری نظر سے گزر چکے تھے۔ میں نے غیر ملکی اخبار نویس سے کہا کہ محکمہ سیاحت کی گاڑیاں سیاحوں کو کراچی میں مختلف جگہوں کی سیر کراتی ہیں۔ میں اُسے ساتھ لے کر محکمہ سیاحت کے کاؤنٹر پر گیا۔ ایک خاتون نے پُرتکلف مسکراہٹ سے ہمارا استقبال کیا، لیکن جب میرے دوست نے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ تو کہنے لگیں: "مجھے افسوس ہے۔ آج ہمارا کوئی ٹور نہیں، آپ کل کے لیے اپنی سیٹ بک کرالیں۔"

اُس اخبار نویس نے دوسرے دن شام کے لیے ایک سیٹ بک کرالی، لیکن دوسرے دن جب وہ تیار ہو کر محکمۂ سیاحت کے دفتر پہنچا، تو اُسے پتہ چلا کہ صرف "دو" سیاح اس ٹور کے لیے بک ہو سکے تھے، اس لیے یہ ٹور منسوخ کر دیا گیا ہے۔ کاؤنٹر پر موجود خاتون نے بتایا کہ کل تک اگر چھ سیاح میسر آگئے، تو ٹور کا اہتمام کر دیا جائے گا، لیکن تین روزہ قیام کے دوران ہمارے اس چیکی دوست کو محکمہ سیاحت کے "AROUND KARACHI" ٹور میں جانے کا موقع نہ مل سکا۔

تیسرے دن جب وہ راولپنڈی جانے کی تیاری کر رہا تھا، ٹیلیفون کی گھنٹی بجی اور محکمہ سیاحت کی ایک خاتون ملازمہ نے بتایا: "آج شام آپ کراچی کے ٹور پر جانے کے لیے تیار ہو جائیں، ہماری گاڑی آپ کو ہوٹل سے لے لے گی۔" اجنبی سیاح طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہنے لگا:

"اگر پی آئی اے کے جہاز کے مسافر بھی پورے نہ ہوئے اور فلائیٹ کینسل ہوگئی تب ہی میں شام کو ٹور پر جا سکوں گا۔" ہو سکتا ہے محکمہ سیاحت کے لیے یہ واقعہ معمول کی بات ہو، لیکن اس سے پاکستان میں "سیاحت کے فروغ کی کوششوں" پر روشنی ضرور پڑ جاتی ہے۔

ایک محتاط اندازے کے مطابق پاکستان میں میسّر سیاحتی سہولتوں کی بنا پر غیر ملکی سیاح اوسطاً صرف ۳ و ۵ راتیں پاکستان میں گذارتے ہیں جبکہ ہندوستان

میں یہ اوسط تقریباً پندرہ راتیں ہے۔ ۱۹۶۸ء میں صرف ستانوے ہزار تین سو بانوے غیر ملکی سیاح پاکستان آئے مگر اسی سال ایک لاکھ ستاسی ہزار سیاح ہندوستان گئے۔ اسی دوران ایران میں سیاحوں کی تعداد تقریباً دو لاکھ پچاس ہزار تھی جبکہ تین لاکھ اسّی ہزار تین سو دو سیاحوں نے ترکی کا دورہ کیا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ۱۹۶۸ء ہی کے دوران تقریباً ساٹھ لاکھ پچاس ہزار سیاح پاکستان کو نظر انداز کر کے مشرقِ بعید کے سیاحی مقامات پر گئے۔

ہمارا محکمہ سیاحت کیا کر رہا ہے؟ اور ملک میں سیاحت کو فروغ دینے میں کیوں اب تک ناکام رہا ہے؟ یہ معلوم کرنے کے لیے محکمہ کا مختصر جائزہ پیشِ خدمت ہے:

قیامِ پاکستان کے وقت سیاحت کا کوئی باقاعدہ محکمہ نہیں تھا۔ یہ شعبہ ریلوے پبلسٹی کا ہی ایک حصہ تھا۔ ۱۹۵۶ء تک یہی صورتِ حال رہی۔ اس کے بعد اربابِ اختیار نے ایک نفع بخش صنعت کی حیثیت سے سیاحت کی اہمیت محسوس کی اور اسے مرکزی وزارتِ مواصلات کے تحت کر دیا گیا۔ اس وقت یہ شعبہ ایک ڈائرکٹر اور اس کے عملے پر مشتمل تھا۔

۱۹۶۱ء میں اسے مرکزی وزارتِ اطلاعات و نشریات کے حوالے کیا گیا، لیکن صرف چھ ماہ بعد ہی مرکزی وزارتِ تجارت کو الاٹ ہوا۔

اس عرصے میں کوئی قابلِ ذکر کام انجام نہ دیا جا سکا۔ کیونکہ اس کی حالت ایک ایسے پتھر سے زیادہ نہیں ہے، جسے جب جس کا جی چاہے، ٹھوکر مار کر اِدھر سے اُدھر کر دے۔

اوائل ۱۹۶۴ء میں محکمہ سیاحت کو وزارتِ دفاع کے ساتھ منسلک کر کے چیف ایڈمنسٹریٹر پی آئی اے اور محکمہ شہری ہوابازی کے ماتحت کر دیا گیا۔ حکومت کا اندازہ تھا کہ تینوں اداروں کی مشترکہ کوششوں سے سیاحت کو بہت زیادہ فروغ ملے گا۔ اور اس طرح اب تک پس ماندہ TOURIST POTENTIAL کو زیادہ سے زیادہ ترقی دینا ممکن ہو جائے گا۔ اوائل ۱۹۶۸ء میں ایئر وائس مارشل اختر پی۔ آئی اے کے صدر مقرر ہوئے تو محکمہ سیاحت چیف ایڈمنسٹریٹر پی۔ آئی اے اور محکمہ شہری ہوابازی سے الگ کر دیا گیا؛ تاہم یہ محکمہ وزارتِ دفاع سے بدستور منسلک رہا اور آج تک ہے۔

۱۹۵۸ء میں سیاحی مرکزوں کی ترقی اور شہرت کے لیے ایک مختصر المیعاد منصوبہ تیار ہوا۔ چند بیرونی ماہرینِ سیاحت پاکستان کے سیاحی مرکزوں کا جائزہ لینے کے لیے بلائے گئے۔ محکمہ سیاحت نے کچھ فلمیں اور کتابچے تیار کیے۔ اندرون اور بیرون ملک مشتہری اقدامات کیے گئے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پاکستان بین الاقوامی سیاحتی نقشے پر اُبھر آیا اور سیاحوں کی تعداد میں خاصا اضافہ ہوا۔ یہاں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ جناب ایم۔ بی ملک (محکمے کے پہلے ڈائرکٹر) اور جناب ایم۔ زیڈ کیانی (جنہوں نے تین سال تک ۶۴-۱۹۶۱ء محکمے کا چارج سنبھالے رکھا) کی کوششوں کے نتیجے میں اس محکمے کی مضبوط بنیادیں استوار ہو گئیں۔ اس عرصے میں کئی علاقائی دفاتر کھولے گئے جن میں تربیت یافتہ افسرانِ تعلقاتِ عامہ کا تقرر ہوا۔

۱۹۶۴ء میں جنابِ مسعود محمود جو اس سے قبل پولیس میں تھے، ڈائرکٹر محکمہ سیاحت مقرر ہوئے۔ اس محکمے میں مزید وسعت پیدا کی گئی اور مزید ڈپٹی ڈائرکٹر، اسسٹنٹ ڈائرکٹر، ٹورسٹ آفیسر اور دوسرے عملے کا تقرر ہوا۔ کچھ ہی عرصے بعد مسعود محمود صاحب ڈائرکٹر جنرل بنا دیے گئے۔

مسعود صاحب کے زمانے میں دفتری چپقلش، سازشوں اور سیل بندی کو بھی خاصا فروغ ملا۔ بڑے عہدوں پر نئے تقرر ہوئے۔ پرانے اہل کار (جو اپنی ترقی کی آس لگائے بیٹھے تھے) اور نئے افسروں میں چپقلش شروع ہو گئی۔ نوبت ایک دوسرے سے عدمِ تعاون تک جا پہنچی۔

محکمہ سیاحت نے اس عرصے میں کئی ترقیاتی کام بھی سرانجام دیے، مگر کام سے زیادہ اُس کی پبلسٹی پر توجہ دی گئی ــــ سب سے زیادہ قابلِ ذکر بیس سالہ ماسٹر پلان ہے۔ اس پلان میں ملک میں سیاحت کو فروغ دینے اور ٹورزم ڈیولپمنٹ کارپوریشن قائم کرنے کی سکیم شامل تھی۔ غالباً یہ سب سے بڑا کام تھا جو اب تک محکمہ سیاحت نے سرانجام دیا۔ ڈائرکٹر جنرل نے اس پلان کو تیار کرنے اور حکومت سے اسے منظور کرانے کا سہرا اپنے سر لیا، لیکن کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اس پلان کے خالق دراصل محکمے کے سابق ڈپٹی ڈائرکٹر کیپٹن جمیل شاہ ہیں، جنہوں نے مسعود محمود صاحب کے رویے اور ان کے آمرانہ اطوار کی بنا پر استعفیٰ دے دیا۔

آج کل محکمۂ سیاحت پاکستان کے سربراہ خواجہ مسرور حسن (PSP) ہیں۔

*

۱۹۶۳ء میں اس محکمے نے پاکستان انسٹیٹیوٹ آف آرٹس اینڈ ڈیزائن کو کچھ کتابچے اور پوسٹر تیار کرنے کا آرڈر دیا۔ محکمے کے کل تیرہ پوسٹروں میں نو بہترین اور خوبصورت پوسٹر اسی انسٹیٹیوٹ کے تیار کردہ ہیں۔ کتابچوں میں تین بہترین مطبوعات (سندر بن، پشاور اور کراچی) کے ڈیزائن بھی اسی انسٹیٹیوٹ نے تیار کیے، لیکن چھ سال گزرنے کے باوجود انسٹیٹیوٹ کو بارہ ہزار روپیہ کا بل ادا نہیں کیا گیا۔ انسٹیٹیوٹ کے ضعیف العمر ڈائرکٹر جنابِ شیخ احمد دین کا بیشتر وقت اپنے بلوں کی وصولیابی کے لیے محکمہ سیاحت کے دفاتر میں گذارتے ہیں۔ اس وجہ سے لوگ ان کو محکمۂ سیاحت کا ملازم سمجھنے لگے ہیں۔

*

محکمہ سیاحت کے پاس پبلسٹی فنڈ کی بہتات کے باوجود ٹورسٹ لٹریچر کی ہمیشہ کمی رہتی ہے۔ جو معلوماتی کتابچے سیاحوں کو مختلف ٹورسٹ کاؤنٹروں، ہوٹلوں اور ٹریول ایجنسیوں میں دیے جاتے ہیں، وہ کئی کئی سال پہلے کی معلومات پر مشتمل ہیں۔ اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ آپ کسی علاقے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے جاتے ہیں، لیکن اس سلسلے میں کوئی لٹریچر دستیاب نہیں ہوتا۔

وادئ کاغان اور دوسرے پہاڑی علاقوں پر ایک کتابچہ ۱۹۶۲ء میں طبع ہوا۔ ۶۳ء میں اسے دوبارہ چھاپا گیا تھا۔ کچھ عرصہ پہلے تک یہی کتابچہ سیاحوں کو دیا جاتا رہا۔ جس میں نو سال پہلے کی تفصیلات تھیں، لیکن اب اگر آپ کاغان کے متعلق لٹریچر طلب کریں، تو یہی جواب ملے گا کہ کتابچہ ابھی زیرِ طبع ہے۔ یہ جواب خاصے عرصے سے دیا جا رہا ہے۔

نامکمل معلومات پر مشتمل کتابچوں کی بنا پر سیاحوں کو تکلیفیں اُٹھانا پڑتی ہیں۔ سفری سہولتوں کے بارے میں جو معلومات ان کتابچوں میں درج ہیں، وہ سہولتیں اب ان جگہوں پر دستیاب نہیں۔ کوئٹہ، سوات اور کچھ دوسری جگہوں کے بارے میں چھاپے گئے کتابچے اس کی واضح مثال ہیں۔

محکمۂ سیاحت نے مختلف سیاحی مرکزوں کے بارے میں بڑے حسین اور خوبصورت پوسٹر تیار کرائے تھے، لیکن یہ پوسٹر کبھی کسی اہم مقامات مثلاً ہوائی اڈوں، ہوٹلوں، ریلوے سٹیشنوں، سینما اور ٹریول ایجنسیوں کے دفتروں میں نظر نہیں آتے۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ محکمے کے تیرہ سے لے کر پندرہ لاکھ روپے کے سالانہ پبلسٹی بجٹ میں تین سے لے کر پانچ لاکھ روپے صرف مطبوعات کے لیے مخصوص ہیں، لیکن ٹورسٹ کاؤنٹر، ہوٹلوں اور ٹریول ایجنسیوں پر محکمے کے فراہم کردہ لٹریچر سے اس کا اندازہ نہیں ہوتا کہ لاکھوں روپے واقعی اس مد پر خرچ ہوتے ہیں۔

ٹریول ایجنسیوں کے لیے کسی بھی ملک کے محکمہ سیاحت

کی طبع کردہ TRAVEL MANUAL بہت اہم اور ضروری ہے۔ اس میں تمام اہم شہروں اور سیاحی مرکزوں پر مکمل معلومات ہوتی ہیں، اس سے سیاحوں کو خرچ، ٹرانسپورٹ، رہائشی سہولتوں، ہٹوں، ٹیکسیوں اور ریلوں کے کرائے کے بارے میں مکمل معلومات حاصل ہو جاتی ہیں۔ اسے غیر ممالک میں ہر سال یا ہر دوسرے سال چھاپا جاتا ہے۔

ہمارے محکمہ سیاحت نے یہ کارنامہ اپنی زندگی میں صرف ایک مرتبہ انجام دیا۔

۶۷ء میں دو سال کی محنتِ شاقہ کے بعد TRAVEL MANUAL طبع ہوا۔ اس کی پانچ ہزار جلدوں پر تقریباً اسی ہزار روپے لاگت آئی۔ لیکن طباعت کے فوراً بعد ہی اس کی اشاعت (CIRCULATION) روک دی گئی، کیونکہ زیادہ تر معلومات پرانی تھیں۔ صرف نمونتاً چند کاپیاں ٹریولنگ ایجنسیوں کو بھیجی گئیں۔ نکتہ چینی کی بوچھاڑ سے محکمے کو باقی کتابیں بھیجنے کا حوصلہ نہ ہو سکا۔ اس کے علاوہ یہ کہ (TRAVEL MANUAL) چھاپنے کی غلطی دوبارہ نہیں کی۔ اب سُنا ہے محکمہ اسے دوبارہ چھپوا رہا ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ اخبارات نے اس کے متعلق خبریں چھاپ دی ہیں۔

کئی بار محکمہ سیاحت نے سیاحوں کے لیے "نیوز بلیٹن" چھاپنے کا ارادہ بھی کیا، لیکن یہ ارادہ فائلوں کے ڈھیر میں گم ہو کر رہ گیا۔ دُنیا کے تمام وہ ممالک جو سیاح کو (ATTRACT) کرنا چاہتے ہیں۔ ٹورسٹ "نیوز بلیٹن" باقاعدگی سے چھاپتے ہیں، جن میں سیاحوں کے لیے تازہ ترین معلومات ہوتی ہیں۔ سیلون جیسے چھوٹے ملک میں بھی یہ سیاحتی نیوز بلیٹن بڑی باقاعدگی سے شائع ہوتا ہے، لیکن ہمارا محکمہ سیاحت جس کا مطبوعات کا سالانہ بجٹ تین سے پانچ لاکھ روپے ہے آج تک بلیٹن نہ چھاپ سکا۔

غیر ملکی زبانوں میں مطبوعات پر بھی بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ اب تک صرف ایک ٹورسٹ گائیڈ اور ایک ٹورسٹ نقشہ جرمن اور فرانسیسی زبانوں میں چھاپا گیا ہے جو غلطیوں سے پُر ہے۔ ماہرینِ سیاحت کا خیال ہے کہ جاپانی سیاح ہمارے ہاں آنا پسند کرتے ہیں، مگر جاپانی تو دُور کی بات ہے، عربی، فارسی، ترکی اور قریبی ممالک کی دوسری زبانوں میں لٹریچر شائع کرنے کے بارے میں سوچنا تک بھی شاید گناہ سمجھ لیا گیا ہے۔

تقریباً دو سال ہوئے محکمہ سیاحت نے غیر ملکی سیاحوں کو تفریح بہم پہنچانے کے لیے چٹاگانگ ہل ٹریک میں رقاصوں کا ایک قبائلی طائفہ ترتیب دیا۔ سوچا یہ گیا کہ غیر ملکی سیاحوں کے لیے چکمہ، مورنگ اور دوسرے قبائل کے رقص کافی دلچسپی کا باعث ہوں گے۔

پچاس ہزار روپے کی رقم سے رنگامتی، کاکس بازار اور مولوی بازار میں تین قبائلی طائفے ترتیب دیے گئے۔ اس رقم کا زیادہ تر حصہ ان تینوں طائفوں کی تنخواہوں پر خرچ ہو گیا، لیکن ان کے ملبوسات، سازوں اور دوسری چیزوں پر واجبی سی رقم خرچ کی گئی، جبکہ ان تینوں طائفوں میں سے ایک کا بھی کوئی پروگرام نہیں ہو سکا۔ ان کی یادگار کے طور پر محکمے کے پاس چند ملبوسات اور ساز ابھی تک موجود ہیں۔

وزارتِ دفاع نے محکمے سے رپورٹ طلب کی کہ اس بدعنوانی کی تحقیقات کی جائے اور ذمہ دار عناصر کی نشاندہی کی جائے۔ شنید یہی ہے کہ محکمے نے آج تک اس وضاحت کا کوئی جواب نہیں دیا۔

ہو سکتا تھا اس واقعے کی تفصیلات فائلوں میں دبی رہتیں اور وزارتِ دفاع کو اس کی ہوا بھی نہ لگتی لیکن ہوا یہ کہ ایک نئی اسکیم کے سلسلے میں اس کا حوالہ دینا پڑ گیا، تو یہ تفصیلات منظرِ عام پر آ گئیں:

اس نئی اسکیم کے تحت محکمہ سیاحت مشرقی پاکستان جانے والے سیاحوں کے لیے ڈھاکے میں ثقافتی تقریبات منعقد کرے گا۔ اس مقصد کے لیے ڈھاکے کی مختلف ثقافتی انجمنوں کو مالی مدد دینے کا پروگرام بنایا گیا ہے، تاکہ وہ سیاحوں کے لیے مختلف پروگرام ترتیب دے سکیں۔ اس کے علاوہ خبر گرم ہے کہ پی آئی اے آرٹ اکیڈیمی بھی محکمہ سیاحت کے حوالے کی جا رہی ہے۔ دیکھئے اس اکیڈیمی کا کیا حشر ہوتا ہے؟

✱

محکمہ سیاحت کے کارپردازوں کو حکومت سے ہمیشہ یہ شکایت رہی ہے اور کسی حد تک یہ شکایت بجا بھی ہے کہ سیاحتی ترقیاتی پروگراموں کے لیے خاطر خواہ فنڈ فراہم نہیں کیے جاتے بلکہ بعض اوقات منظور شدہ فنڈز میں کمی کر دی جاتی ہے۔ یہ شکایت کسی نہ کسی حد تک صحیح بھی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ سیاحوں کی آمد سے جو زرِ مبادلہ حاصل ہوتا ہے وہ محکمہ سیاحت کے پاس تو آتا نہیں، اس لیے یہ احساس نہیں ہوتا کہ محکمہ کچھ کما کر بھی دے رہا ہے۔ حالانکہ سیاحت بھی برآمدی تجارت ہے، اگر اس کا مقابلہ برآمدی ترقیاتی بیورو سے کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ نسبتاً کم خرچ کر کے سیاحت کا شعبہ زیادہ زرِ مبادلہ کماتا ہے، جب کہ پٹ سن، کپڑے اور دیگر برآمدی اشیا سے حاصل ہونے والے زرِ مبادلہ میں ہماری خام چیزیں استعمال ہوتی ہیں۔ سیاحت میں زرِ مبادلہ کی آمدنی کا بڑا ذریعہ لوگوں کی سروسز (SERVICES) ہیں، قدرتی وسائل پر اس کا بوجھ کم پڑتا ہے۔

اگر حقائق کا جائزہ لیا جائے، تو پتہ چلتا ہے کہ یہ محکمہ اب تک حکومت کے فراہم کردہ "ناکافی فنڈز" کو بھی پوری طرح استعمال کرنے میں ناکام رہا ہے۔

محکمہ سیاحت کے اپنے ہی اعداد و شمار کے مطابق ۶۶-۶۵ء میں باون لاکھ روپے سیاحت کی ترقی کے لیے مختص کیے گئے، لیکن محکمہ سیاحت اس سال صرف اٹھائیس لاکھ پینسٹھ ہزار روپے خرچ کر سکا۔ اس سے اگلے سال یعنی ۶۷-۶۶ء میں اسی لاکھ روپے میں سے صرف تینتالیس لاکھ چھبیس ہزار روپے خرچ کیا گیا اور باقی ساری رقم حکومت کو واپس کر دی گئی۔ ۶۸-۶۷ء میں ستاون لاکھ اکہتر ہزار روپیہ کے بجٹ میں سے صرف چالیس لاکھ اٹھارہ ہزار روپیہ خرچ کیا جا سکا۔ پچھلے مالی سال ۶۹-۶۸ء کے دوران میں محکمے کو حکومت نے چوالیس لاکھ تیس ہزار روپیہ فراہم کیا جس کے بارے میں محکمے کے کارپردازوں کا دعویٰ ہے کہ اس کا بیشتر حصہ حکومت نے استعمال کر لیا۔

✱

اس کے باوجود محکمے کے کئی اعلیٰ افسران یہ سمجھتے ہیں کہ وہ مثالی کارکردگی کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ اگر کسی غلطی کی نشاندہی کر دی جائے، تو افسرانِ متعلقہ سخت ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔

حال ہی میں کراچی کے ایک ممتاز صنعت کار جناب حاتم علوی نے نتھیا گلی اور دیگر قریبی علاقوں کی سیر کے بعد ایک مقامی انگریزی روزنامے کو ایک مراسلہ لکھا جس میں محکمہ سیاحت پر کچھ نکتہ چینی کی گئی تھی۔ اس خط پر کیا محکمانہ کارروائی کی گئی، اس کا تو کچھ پتا نہ چل سکا لیکن ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے محکمے کے ایک ڈپٹی ڈائرکٹر نے یہ ضرور ارشاد فرمایا کہ لوگوں کو شاید کوئی اور کام نہیں ہوتا جو وہ اخباروں میں خط لکھ مارتے ہیں۔ صبح ناشتے پر بیوی سے جھگڑا ہوتا ہے تو غصہ محکمہ سیاحت پر اتارا جاتا ہے۔

✱

کچھ عہدیداروں نے محکمہ سیاحت کو اپنے سفلی جذبات کو تسکین دینے کا ذریعہ بھی بنا رکھا ہے۔

تقریباً ڈیڑھ دو سال ہوئے۔ دو فرانسیسی صحافی لڑکیاں

پاکستان آئیں۔ یہاں ان کی ملاقات محکمہ سیاحت کے ایک ڈپٹی ڈائریکٹر سے ہوئی جنہوں نے محکمے سے خاطر خواہ سہولتیں مہیا کرنے کا وعدہ کیا اور انہیں رات کے کھانے پر مدعو کیا گیا اور ایک مقامی کلب میں انہیں شراب پلانے اور کھانا کھلانے کے بعد (محکمہ سیاحت کے خرچ پر یا شائد اپنی جیب سے) وہ انہیں اپنے گھر لے گئے اور ایک لڑکی پر مجرمانہ حملہ کرنے کی کوشش کی۔ اس پر وہ دونوں لڑکیاں ان کے گھر سے بھاگ کھڑی ہوئیں۔ کراچی میں تو شاید ان کی ملاقات ڈائریکٹر جنرل صاحب سے نہ ہو سکی، لیکن لاہور جا کر انہوں نے اس واقعے کی صوبائی حکومت کے ایک اعلیٰ افسر سے شکایت کر دی۔ اس افسر نے معاملے کی اطلاع مرکزی حکومت کو کر دی، لیکن سُرخ فیتے کا نسخہ متعلقہ افسر کے کام آیا اور معاملہ حسب معمول فائلوں کے انبار میں دب گیا۔

محکمہ سیاحت میں دیانتدار اور قابل کارکنوں اور افسروں کی کمی نہیں، لیکن حالات ان کو اپنا کام دیانتداری سے سرانجام دینے کی اجازت نہیں دیتے۔ چند مفاد پرست اور لالچی افراد صرف اپنے فائدے کو مدِ نظر رکھتے ہوئے پورے محکمے کو بیکار اور بدنام کیے ہوئے ہیں اگر حکومت کو ملک میں سیاحت کی ترقی مطلوب ہے، تو اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ ایماندار اور محنتی افسروں کو آگے لایا جائے اور ان کو اہم ذمہ داریاں سونپی جائیں۔

ہماری سمجھ سے یہ بات بالاتر ہے، شاید محکمہ سیاحت کے ذمہ دار افراد یہ بات سمجھا سکیں کہ ایک سرکاری افسر جس کی تنخواہ آٹھ یا نو سو روپے ماہانہ ہو، صرف تین سال محکمہ سیاحت میں ملازمت کرنے کے بعد دو کاروں کا مالک کس طرح بن سکتا ہے؟ یا یہ کہ سات آٹھ سو روپے پانے والا افسر چار سو روپیہ ماہانہ کرایہ کے مکان میں رہ کر بھی قیمتی کاریں اور دوسرا سامان کیسے خرید سکتا ہے؟ آخر یہ کیونکر ممکن ہے کہ سرکاری عہدہ سنبھالنے کے کچھ ہی دنوں بعد خاندانی حالات اتنے بہتر ہو جائیں کہ گھر کی کایا ہی پلٹ جائے۔۔

ابنِ انشا

ایک وضاحت ——— ایک شکایت

زندگی کے گذشتہ شمارے میں آپ کے مکتوب نگار "راول پنڈی" ناصر عباس صاحب نے اسلام آباد کی ادبی اور لسانی کانگرس کا ذکر کیا ہے۔ میں جنگ میں دو کالم اس اجتماع کے بارے میں لکھ چکا ہوں۔ اس میں کچھ باتیں کانگرس کے داعیان کے متعلق تھیں اور سخن گسترانہ تھیں۔ کچھ اپنے ادیب اور دانشور دوستوں کے بارے میں کچھ ذکر بربنائے خوش طبعی اعجاز حسین بٹالوی کا بھی تھا کہ اس کانگرس کے روحِ رواں تھے، لیکن میرے مضمون میں کہیں آپ کو ادنیٰ سا اشارہ اس قسم کا نہ ملے گا کہ کسی فردِ واحد نے اس سے مالی تمتّع حاصل کیا ہے —

ناصر عباس صاحب نے جو لکھا ہے کہ "آغا بابر کے برادرِ خورد اعجاز بٹالوی کو مبلغ ۲۵ ہزار روپے چہرہ شاہی کی رقم کانفرنس کے سلسلے میں دی گئی" اور یہ بھی کہ "اس ذکر کو خاصی شرح و بسط کے ساتھ محافل میں گرمیٔ محفل پیدا کرنے کے لئے بار بار دہرایا گیا"۔ اور نیز یہ کہ "یہ رقم اعجاز بٹالوی کو اس وعدے کے ساتھ دی گئی تھی کہ حساب دوستاں در دِل کی طرح اس کا حساب نہیں مانگا جائے گا"۔ یہ سب زیادتی ہے۔ ایسی کوئی بات کسی محفل میں، کسی ذریعے سے ہم نے نہیں سنی۔ آرگنائزر کوئی فردِ واحد نہیں تھا، ذمہ دار لوگ تھے۔ مجھے اور میرے ساتھیوں کو جو کراچی سے گئے تھے اور اس کانگرس کے چنداں مدّاح بھی نہیں

اس تحریر کے آپ کے پرچے میں چھپنے کا بہت افسوس ہے۔ میں پھر کہوں گا کہ اعجاز بٹالوی صاحب کو میں نہ فضلائے ادب میں شمار کرتا ہوں نہ علمائے لسانیات میں۔ بلکہ اپنے ایسا یا کچھ قدر بہتر ادیب خیال کرتا ہوں، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کی نیت یا دیانت کے متعلق کوئی شبہے کی بات ہے۔ حاشا، نہیں۔ اس مضمون میں مجھ سے یہ بیان منسوب کیا گیا کہ "میں خود آیا نہیں، لایا گیا ہوں۔" یہ بھی غلط ہے۔ زبردستی کسی نے نہیں کی۔ دعوت نامے ملنے پر جس کا جی چاہا، آیا۔ جس کا جی چاہا نہ آیا۔ مجھ سے حلقۂ اربابِ ذوق پنڈی کے جلسے میں یہ سوال کیا گیا تھا کہ اس کانگرس میں، جس کے متعلق لوگوں کو یہ یہ گمان ہیں، آپ کیوں شریک ہوئے۔ میں نے عرض کیا کہ میری رائے اس اجتماع کے بارے میں میرے کالموں سے آپ کو معلوم ہو جائے گی۔ خیر یہ نکتہ تو معمولی ہے، لیکن دوسری بات معمولی نہیں۔۔

نہایت نفع بخش کاروبار

بجلی کے مختلف قسم کے چودہ پنکھے اور ایئر کولر تیار کرنے والی بالکل چالو لمیٹڈ فیکٹری

جس کے پاس علاقے کا سب سے بڑا، بہترین مشینری سے لیس ورکشاپ ہے، جس میں ملنگ، رندا، شیپر، خراد، پریس، الیکٹرک و گیس ویلڈنگ، مولڈنگ، ڈیکو سپرے پینٹ، ریوائنڈنگ، نکل، کرومیم اور جست چڑھانے کے پلانٹ موجود ہیں۔ جس کا ڈیڑھ لاکھ روپے سالانہ کا درآمدی لائسنس منظور ہے۔ جس نے اپنی اشیا کی فروخت کے لیے وسیع مارکیٹ بنالی ہے اور اپنے علاقہ سے ہی کاریگروں کی بہت بڑی کھیپ تیار کر لی ہے۔ اسے صرف بنکوں سے سودی کاروبار نہ کرنے کی وجہ سے اور کام کو مزید بڑھانے کے لیے ۲۰ نومبر ۶۹ء تک نئے حصہ داروں کی ضرورت ہے۔ ۲۰ نومبر ۵ بجے شام حصص کی الاٹمنٹ بند کر دی جائے گی۔

خواہش مند حضرات اس سنہری موقع سے فائدہ اٹھانے کے لیے درج ذیل پتہ پر خط و کتابت یا ملاقات فرمائیں۔

احمد حسین باجوہ مینجنگ ڈائریکٹر
ایس۔ اے۔ کے الیکٹریکل انڈسٹریز۔ لمیٹڈ
پوسٹ بکس ۱۲۔ فیکٹری ایریا۔ رحیم یار خان

فون دفتر { ۱۷۱، ۳۷۱
فیکٹری : ۲۰۶
رہائش : ۲۷۱

ایک صحافی کی ڈائری ——— ضمیر صدیقی

نواب ممدوٹ ——— پنجاب کا "گونگا پہلوان"

نواب ممدوٹ کی موت کی خبر سنتے ہی برصغیر کی گذشتہ تیس سالہ تاریخ میری آنکھوں کے سامنے پھر گئی۔ افتخار حسین ممدوٹ سے میری پہلی ملاقات دہلی جنکشن پر اس وقت ہوئی جب وہ اپنے والد کے ہمراہ بمبئی سے لاہور جا رہے تھے۔ چھریرے بدن والے افتخار حسین نے کالی شیروانی اور ترکی ٹوپی پہن رکھی تھی۔ وہ اس وقت بھی چپ سے کھڑے رہے، اور بعد میں بھی ان کی زندگی ایک "خاموش آدمی" کی طرح گزری۔ وہ سیاست میں شور و شغب کے کبھی عادی نہیں رہے۔ اپنے والد کی طرح وہ بھی کٹر مسلم لیگی تھے۔ تحریکِ پاکستان کے دوران ان کی خدمات ان گنت ہیں۔ نواب صاحب کی بہت بڑی جاگیر ضلع فیروزپور میں تھی، پاکستان بننے کے بعد انہوں نے پاک وطن کی خاکِ پاک کو ہزاروں مربع میل اراضی پر ترجیح دی۔

وہ مغربی پاکستان کے پہلے وزیرِ اعلیٰ بنے، لیکن طویل عرصے تک یہ عہدہ ان کے پاس رہ نہ سکا، نہ ہی وہ پاکستانی سیاست میں اپنے لیے کوئی بہت بڑا مقام پیدا کر سکے۔ نواب صاحب کے سیاسی نظریات خواہ جو کچھ بھی رہے ہوں، اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سیاسیات میں ان کے غلط اندازوں نے انہیں بہت زیادہ نقصان پہنچایا۔

ان کے سیاسی کیریئر کو پہلا دھچکا وزیرِ اعلیٰ بننے کے دو سال کے اندر اندر ہی لگا۔ میاں دولتانہ ان کی وزارت میں سینئر وزیر تھے۔ دولتانہ صاحب اور نواب صاحب میں غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں، کہا جاتا ہے کہ کچھ لوگوں نے جان بوجھ کر انہیں فروغ دینے کی کوشش کی۔ بلاشبہ، میاں دولتانہ امنگ بھرے (AMBITIOUS) سیاستدان ہیں، لیکن شاید یہ بات صحیح نہ ہو کہ انہوں نے نواب صاحب کے خلاف باقاعدہ سازش کی تھی۔ بہرحال، نواب صاحب اور میاں صاحب کے اختلافات بڑھتے گئے اور وہ وقت آ پہنچا کہ ایک ہی کابینہ کے نیام میں ان دو تلواروں کا سمانا مشکل ہو گیا۔ معاملہ لیاقت علی تک پہنچا۔ وہ بڑے مخمصے میں پڑ گئے، ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کسے رکھیں اور کسے نکالیں؟۔ میں لیاقت علی خاں کے بہت قریب رہا ہوں، اس لیے ان کی اس کیفیت کا مجھے ذاتی طور پر علم ہے۔ انہوں نے ان دونوں دوستوں کو کراچی بلایا اور ان میں مفاہمت کرانے کی سر توڑ کوشش کی۔ لیاقت علی خاں مرحوم دونوں میں سے کسی کو بھی اختلاف دور کرنے پر آمادہ نہ کر سکے۔ اس وقت پاکستان بڑی بھیانک داخلی اور خارجی صورتِ حال سے دوچار تھا، ایک طرف مہاجرین کے لٹے پٹے قافلوں کا سیلاب بہہ رہا تھا، دوسری طرف بھارت اپنے جارحانہ عزائم کو عملی جامہ پہنانے کے درپے نظر آتا تھا۔ کشمیر میں حالات بہت دگرگوں تھے۔ اس لیے لیاقت علی خاں مرحوم کوشش کرتے رہے کہ یہ دونوں حضرات اس مشکل مرحلے میں یک جان دو قالب ہو کر کام کریں، ممدوٹ، دولتانہ کش مکش نوزائیدہ پاکستان کے لیے ایک نیا تجربہ تھی۔ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر پاکستان کے حصول کی جدوجہد کرنے والے اب ایک دوسرے کے لیے شمشیرِ بے نیام بنے ہوئے تھے۔ لیاقت علی خاں اچھی طرح سمجھتے تھے کہ پنجاب کو پاکستان میں بڑی اہمیت حاصل ہے، انہیں احساس تھا کہ ان کے بعد قیادت، پنجاب میں منتقل ہو جائے گی۔ چنانچہ انہوں نے میاں ممتاز دولتانہ کو منتخب کر لیا، میاں دولتانہ پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ بن گئے۔ اس پر پنجاب کے کئی اخبارات نے لیاقت علی خاں مرحوم کے خلاف مہم کا آغاز کر دیا اور ان پر الزام لگایا گیا کہ وہ پنجاب اور پنجابیوں کے مفادات کو زک پہنچا رہے ہیں۔ میری دانست میں یہ الزام درست نہیں تھا، میاں دولتانہ بھی تو پنجابی ہی تھے۔ اور ایک پنجابی کا انتخاب پنجاب کے مفادات کے خلاف کیسے ہو سکتا تھا؟ تاہم، نواب ممدوٹ کے ذہن میں یہ خیال راسخ ہو گیا کہ لیاقت علی خاں نے ان کے ساتھ بڑی ناانصافی کی ہے۔

نواب صاحب کی یہ بے اطمینانی فطری تھی۔ انہوں نے پاکستان کی خاطر بڑے مصائب برداشت کئے تھے، اس لیے ہر شخص کے دل میں ان کی عزت اور قدر و منزلت تھی۔ جب انہوں نے پارٹی چھوڑی اور جناح مسلم لیگ کی بنیاد رکھی، تو اس کے باوجود کہ یہ پہلی باقاعدہ حزبِ اختلاف تھی، ان کے اس اقدام کو بہت سے سنجیدہ سیاسی حلقوں نے بنظرِ استحسان نہ دیکھا؛ کیونکہ اس کی بنیاد تو بہرحال ذاتی پرخاش پر ہی تھی۔ نواب ممدوٹ کو عوامی حمایت حاصل نہ ہو سکی، عوام ابھی تک مسلم لیگ سے مایوس نہیں ہوئے تھے اور سمجھتے تھے کہ ان کی مشکلات یہی جماعت ختم کرا سکتی ہے۔ نواب ممدوٹ اپنی اس سیاسی کھیتی کی آبیاری کرتے رہے۔ اسی دوران سہروردی مرحوم سے لیاقت علی خاں مرحوم کی ان بن ہو گئی۔ سہروردی نے محسوس کیا کہ لیاقت علی صاحب ان کے "سیاسی امیج" کو مجروح کرنا چاہتے ہیں، انہوں نے عوامی مسلم لیگ کی بنیاد رکھ دی۔ بعد میں ممدوٹ اور سہروردی کا "ادغام" ہو گیا اور جناح عوامی لیگ کے نام سے نئی پارٹی وجود میں آ گئی۔ نواب صاحب، دولتانہ سے اپنی شکست کا بدلہ لینے کے لیے بڑے بے چین تھے، وہ سیاست میں "لڑھکتا روڑا" بن گئے۔ کبھی اِدھر اور کبھی اُدھر۔ ۱۹۵۶ء میں جب کچھ سابق یونینسٹوں نے مل کر ایک نئی پارٹی کی بنیاد ڈالی، تو تحریکِ پاکستان کا یہ مجاہد اس میں شامل ہو گیا۔ بعد میں ایوب خاں کی مسلم لیگ قائم ہوئی، تو نواب صاحب اس میں شامل ہو گئے اور "کنونشنسٹ" بن گئے۔

*

نواب صاحب کی بدولت آج بہت سے لوگ عیش کی زندگی گزار رہے ہیں۔ انہیں پنجاب کا "گونگا پہلوان"، کہا جاتا تھا۔ وہ برطانیہ اور یونینسٹوں کے خلاف بڑی بے جگری سے لڑے۔ لاہور کے عوام کا فرض ہے کہ وہ نواب ممدوٹ کی خدمات کا اعتراف کرنے کے لیے ان کی یادگار تعمیر کریں، کہ زندہ قومیں اپنے محسنوں کو بھلایا نہیں کرتیں۔

احمد برآت

بیروت

ناصر کے وزیرِ خارجہ کی آنکھ مچولی

"اسرائیل اور مصر کے درمیان براہِ راست بات چیت کے امکانات"۔۔۔ "اسرائیل اور مصر کے درمیان براہِ راست بات چیت نہیں ہوگی"۔۔۔ "اسرائیل اور مصر کے درمیان بالواسطہ بات چیت کے امکانات"۔۔۔ "اسرائیل اور مصر کے درمیان بالواسطہ بات چیت بھی نہیں ہوگی"۔۔۔ گذشتہ ہفتے عالمِ عرب کے اخبارات اور سیاسی حلقوں میں یہ چاروں بیانات نہایت سرگرمی سے زیرِ بحث آئے، مگر ابھی تک کوئی واضح صورت سامنے نہیں آسکی۔ مباحثے کا آغاز اس وقت ہوا جب نیویارک میں مصر کے وزیرِ خارجہ مسٹر محمود ریاض سے یہ بیان منسوب کیا گیا کہ مصر اسرائیل سے بات چیت کرنے پر تیار ہے۔ مشرقِ وسطیٰ میں اس بیان پر بہت سخت ردِ عمل ہوا۔ اگلے ہی روز مسٹر محمود ریاض نے وضاحت کر دی کہ انہوں نے ایسی کوئی پیش کش نہیں کی۔ لیکن نیویارک سے واپس وطن روانہ ہوتے ہوئے انہوں نے اخباری نمائندوں کے سامنے فرمایا کہ "مصر اسرائیل کے ساتھ "رہوڈز فارمولے" پر ایک تیسرے فریق کی موجودگی میں بات چیت کرنے پر تیار ہے"۔ یہی بات انہوں نے قاہرہ آکر بھی کہی۔ ان کے قاہرہ پہنچنے سے ایک روز قبل مصری وزارتِ خارجہ کے نئے سرکاری ترجمان ڈاکٹر عصمت نے بھی مصر کی اس پیش کش کو دُہرایا اور کہا کہ رہوڈز کے جزیرے میں ۱۹۴۹ء میں جن خطوط پر مصر اور اسرائیل کی بات چیت ہوئی تھی، انہی خطوط پر اقوامِ متحدہ کے نمائندوں کی موجودگی میں پھر گفتگو ہوسکتی ہے۔ مصر نے اس پیش کش کے ساتھ ہی یہ وضاحت بھی کر دی کہ "رہوڈز بات چیت" براہِ راست نہیں تھی، بلکہ بالواسطہ تھی۔

اس کے برعکس اسرائیل کے وزیرِ خارجہ ابا ایبان نے مصر کی اس پیشکش کو قبول کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ یہ بات چیت براہِ راست تھی، اس لیے کہ مصر اور اسرائیل کے نمائندے ایک ہی میز پر آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ ابا ایبان نے تیسرے فریق یعنی اقوامِ متحدہ کے نمائندوں کی موجودگی بھی تسلیم کرلی، مگر یہ بھی کہا کہ اب مصر کو محض جنگ بندی کے معاہدے کے لیے نہیں، بلکہ معاہدۂ امن کے لیے بھی تیار رہنا چاہیے۔

ابا ایبان کے اس بیان کے بعد محمود ریاض سے لے کر الانوار السادات تک اور ڈاکٹر عصمت سے لے کر حسنین ہیکل تک سبھی نے مصر کی اس پیش کش کو کالعدم قرار دے دیا اور صاف صاف کہا کہ اسرائیل سے براہِ راست یا بالواسطہ کسی صورت میں بھی بات چیت نہیں ہوسکتی۔ مسٹر محمود ریاض نے تو اپنے قاہرہ کے بیان کی بھی تردید کر دی اور کہا کہ انہوں نے "رہوڈز فارمولے" کو کبھی بھی تسلیم نہیں کیا، تاہم بیروت کے سیاسی حلقوں کا تاثر یہی ہے کہ محمود ریاض نے پہلے نیویارک اور پھر قاہرہ میں ایک طرح کا فیلر چھوڑ کر عرب رائے عامہ کا ردِ عمل معلوم کرنے کی کوشش کی تھی، لیکن جب عالمِ عرب میں اس مجوزہ بات چیت پر غم و غصے کا اظہار کیا گیا، تو انہوں نے تردید کر دی۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ اگر ابا ایبان اپنے اس بیان میں جلدی نہ کرتے کہ "رہوڈز بات چیت" براہِ راست تھی؛ لہٰذا اب بھی براہِ راست بات چیت ہونی چاہیے، تو شاید مسٹر محمود ریاض بھی اس قدر جلد اپنے بیان کی تردید نہ کرتے۔

اسرائیل کی اس وقت سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ وہ کسی طرح براہِ راست گفت و شنید کا فارمولا طے کرا کے عرب ممالک سے اپنے آپ کو تسلیم کرالے۔ دوسری طرف عرب ممالک نہ صرف یہ کہ خرطوم کی سربراہی کانفرنس کے اس فیصلے کے پابند ہیں کہ وہ نہ تو اسرائیل کو تسلیم کریں گے، نہ اس سے کوئی سمجھوتہ کریں گے اور نہ ہی بات چیت بلکہ وہ سلامتی کونسل کی ۲۲ نومبر کی قرارداد کے بھی پابند ہیں، جس میں اسرائیل کے ساتھ "براہِ راست بات چیت" کرنے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

یہاں کے باخبر حلقے اس بات کی طرف بھی توجہ مبذول کرا رہے ہیں کہ جب رہوڈز میں ۲۳ فروری ۱۹۴۹ء کو مصر کے ساتھ جنگ بندی کا معاہدہ عمل میں لایا گیا تھا، اس وقت اسرائیل بحیثیت ایک ریاست کے موجود ہی نہ تھا۔ اسرائیل میں اس وقت عبوری اور عارضی حکومت قائم تھی، جسے باقاعدہ طور پر تسلیم نہیں کیا گیا تھا۔ اسرائیل نے دسمبر ۱۹۴۸ء میں اقوامِ متحدہ کی رکنیت کے لیے جو درخواست دی تھی، اسے اس بنا پر مسترد کر دیا گیا تھا کہ اسرائیل اقوامِ متحدہ کے چارٹر کی خلاف ورزی کا مرتکب ہوچکا تھا۔ ۱۱ مئی ۱۹۴۹ء کو اسرائیل اقوامِ متحدہ کا باقاعدہ رکن بنا، جب کہ رہوڈز کی بات چیت ۲۳ فروری ۱۹۴۹ء کو پایۂ تکمیل تک پہنچ چکی تھی۔ یہاں یہ بات بھی سامنے رہنی چاہیے کہ اسرائیل کی رکنیت اور بحیثیت ایک خود مختار ریاست کے اس کا وجود، اس کے اس وعدے کے ساتھ مشروط تھا کہ وہ:

(۱) اقوامِ متحدہ کے چارٹر کی پابندی کرے گا۔

(۲) جنرل اسمبلی کی اسرائیلی حدود سے متعلق ۲۹ نومبر ۱۹۴۷ء کی قرارداد پر عمل درآمد کرے گا۔

(۳) مہاجرین کی آبادکاری سے متعلق جنرل اسمبلی کے ۱۱ دسمبر ۱۹۴۸ء کے ریزولوشن کی پابندی کرے گا۔

جنرل اسمبلی نے اسرائیل کی رکنیت کی درخواست منظور کرتے ہوئے جو قرارداد منظور کی تھی، اس کے ابتدائیے میں اسرائیل کے ان مواعید کا بالوضاحت ذکر کیا گیا تھا۔ اس پس منظر میں اسرائیل کا یہ کہنا کہ رہوڈز کی بات چیت دو آزاد اور خود مختار ریاستوں کے درمیان بات چیت کی حیثیت رکھتی ہے، تاریخ کے ساتھ ایک سنگین مذاق کی حیثیت رکھتا ہے۔

بہرحال اب جب کہ عالمِ عرب کے شدید ردِ عمل کے بعد "رہوڈز کی بات چیت" کے غبارے سے خاصی حد تک ہوا نکل چکی ہے اور مصر نے اعلیٰ سطح پر اس کی تردید بھی کر دی ہے، مستقبلِ قریب میں اسرائیل اور عرب ریاستوں کے درمیان براہِ راست تو کجا، بالواسطہ بات چیت کا بھی کوئی امکان باقی نہیں رہا۔ مصر نہ صرف یہ کہ خرطوم سربراہ کانفرنس کے اس فیصلے کا پابند ہے کہ وہ اسرائیل سے کسی صورت میں بھی بات چیت نہ کرے گا، بلکہ سربراہ کانفرنس کے اس فیصلے کی خلاف ورزی کرنے کی صورت میں اسے پچانوے ملین (۹۵،۰۰۰،۰۰۰) پونڈ کی اس خطیر رقم سے بھی ہاتھ دھونے پڑیں گے، جو خرطوم کانفرنس کے نتیجے میں اسے کویت، سعودی عرب اور لیبیا کی طرف سے ہر سال امداد کے طور پر مل رہی ہے۔ مصالحت کی اگر کوئی صورت ممکن ہے تو وہ سلامتی کونسل کے ۲۲ نومبر ۱۹۶۷ء کے ریزولوشن پر عمل درآمد ہی ہے، مگر جب تک اسرائیل کو امریکہ کی اخلاقی تائید حاصل رہے گی، اس وقت تک نہ تو وہ مقبوضہ علاقوں کو خالی کرنے پر رضامند ہوگا اور نہ کسی اور بین الاقوامی معاہدے کی پابندی کرنے پر تیار ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ اسرائیل کے رویے سے پوری طرح مایوس ہونے کے بعد سویڈن کے مسٹر گنار یارنگ ماسکو میں اپنے عہدے پر واپس جارہے ہیں۔ اقوامِ متحدہ کے سیکرٹری جنرل اوتھان نے اس بات کی پُرزور تردید کی ہے کہ مسٹر یارنگ مشرقِ وسطیٰ میں امن کے مشن سے دست بردار ہورہے ہیں؛ تاہم ان

کے ماسکو واپس چلے جانے سے یہ بات تو صاف ظاہر ہے کہ مستقبل قریب میں اقوامِ متحدہ کے زیرِ اہتمام مصالحت کا کوئی امکان باقی نہیں رہا۔ اسی دوران میں امریکی وزارتِ خارجہ کے ایک اعلیٰ عہدہ دار اور روسی سفیر مقیم امریکہ کے درمیان بھی مشرقِ وسطیٰ کے مسئلے پر گفتگو ہوئی۔ یہاں پہنچنے والی اطلاعات اور مصری وزیرِ خارجہ مسٹر محمود ریاض کے قاہرہ کے بیان کے مطابق ابھی تک بڑی طاقتوں کی باہم گفتگو کسی نتیجہ خیز مرحلے پر نہیں پہنچ سکی۔ کہا جاتا ہے امریکی اور روسی حکام نیویارک میں اپنی گفتگو جاری رکھیں گے۔ اگر یہ گفتگو کسی ٹھوس نتیجے پر پہنچی، تو برطانیہ اور فرانس کو بھی مطلع کر دیا جائے گا۔

٢

یروشلم میں "ایشمین ٹرائل" کی طرز کا جو ڈرامہ آسٹریلوی نوجوان مائیکل روحان کے مقدمے کی صورت میں کھیلا جا رہا ہے، عالمِ عرب کے اخبارات اور سیاسی حلقے اسے محض ایک فریب قرار دے رہے ہیں۔ یہاں پہنچنے والی اطلاعات کے مطابق اسرائیلی اخبارات نے اس امر پر تعجب کا اظہار کیا ہے کہ عالمِ عرب کے اخبارات نے مسجدِ اقصیٰ کے جلنے پر تو ایک طوفان کھڑا کر دیا تھا اور چاروں طرف سے "الجہاد الجہاد" کی صدائیں بلند ہونے لگی تھیں، مگر اب جب کہ اصل مجرم پکڑا جا چکا ہے اور اس پر باقاعدہ کھلی عدالت میں مقدمہ چلایا جا رہا ہے، تو عرب اخبارات مقدمے کی روداد کو کوئی اہمیت نہیں دے رہے۔ یاد رہے کہ مائیکل روحان اپنے یہودی وکیل کے مشورے پر اپنے جرم کا اعتراف کر چکا ہے۔ اس کے وکیل کی طرف سے اب یہ کہا جا رہا ہے کہ ارتکابِ جرم کے وقت روحان کا دماغی توازن درست نہیں تھا۔

اسرائیلی حکومت اس خوش فہمی میں مبتلا تھی کہ عالمِ عرب اور عالمِ اسلام نے مسجدِ اقصیٰ کے آگ لگائے جانے کے واقعے پر اپنے بے پناہ اضطراب کا اظہار کیا تھا اور اسرائیل کے خلاف متحدہ اقدام طے کرنے کے لیے سربراہ کانفرنس بھی طلب کی تھی؛ لہٰذا جونہی مائیکل روحان کا مقدمہ شروع ہوگا، پورے عالمِ اسلام میں سنسنی پھیل جائے گی۔ اخبارات بڑی بڑی سرخیوں کے ساتھ مقدمے کی خبریں چھاپیں گے اور اسرائیل مسجدِ اقصیٰ کی بے حرمتی کی ذمہ داری سے بچ جائے گا، مگر ہوا یہ کہ عربی اخبارات نے مقدمے کی خبریں اندر کے صفحات میں نہایت ہی غیر نمایاں طور پر شائع کیں اور ان پر ایسی سرخیاں لگائیں جن سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس مقدمے کو محض ایک ڈھکوسلا اور فریب سمجھتے ہیں۔ عرب پریس کے رویے سے ظاہر ہے کہ یہاں اصل مجرم مائیکل روحان کو نہیں بلکہ اسرائیل کو سمجھا جا رہا ہے۔ روحان کی حیثیت تو محض قربانی کے بکرے کی سی ہے جسے اسرائیل کے جرم کو چھپانے کے لیے آگے کیا جا رہا ہے۔ بیروت کے متعدد اخبارات نے مائیکل روحان کے والدین کی اس شکایت کی تائید کی ہے کہ روحان کو مسجدِ اقصیٰ جلانے کے لیے "BRAIN-WASH" کیا گیا تھا۔

٣

گذشتہ ہفتے اردن کی وزارتِ داخلہ نے اردن میں "ناکام انقلاب" کی خبر دے کر عالمِ عرب میں سنسنی پھیلا دی۔ وزارتِ داخلہ کے اعلامیے میں کہا گیا کہ اردن کی حزب التحریر کی طرف سے شاہ حسین کی حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش کی جا رہی تھی جس کا بر وقت پتہ لگا لیا گیا اور سازش میں شریک ہونے والے اکثر افراد کو حراست میں لے لیا گیا ہے۔ اس کے اعلان کے دو روز بعد اردن کے وزیرِ داخلہ نے بیروت کے اخبار "الحیات" کو انٹرویو دیتے ہوئے یہ انکشاف بھی کیا کہ حکومت کی اطلاعات کے مطابق اس سازش میں کچھ "غیر عرب اور اردن دشمن" طاقتیں بھی شریک ہیں۔

حزب التحریر کو آج سے تقریباً بیس برس قبل شیخ تقی الدین نبہانی نے قائم کیا تھا۔ یہ جماعت اسلام کے دائمی اصولوں پر یقین رکھتی ہے اور اس کا موقف یہ ہے کہ عالمِ عرب کی موجودہ تمام حکومتیں اسلام سے انحراف کی راہ پر چل کر عربوں کی قومی حیثیت کو کمزور کر رہی ہیں۔ حزب التحریر کا کہنا یہ ہے کہ جب تک عالمِ عرب میں ایک "کل عرب اسلامی حکومت" قائم نہیں ہوگی، اس وقت تک نہ صرف یہ کہ عرب آپس میں لڑتے رہیں گے، بلکہ اسرائیل اور دوسری بڑی طاقتوں کے لیے بھی لقمۂ تر بنے رہیں گے۔ عربوں کے داخلی انتشار، معاشی بدحالی، قومی ذلت، استعماری خطرات اور اسرائیلی سامراج سے نمٹنے کی واحد صورت یہی ہے کہ تمام عرب حکومتیں اسلام کی بنیاد پر متحد ہو کر ایک فیڈریشن بنا لیں اور پھر اس سے بھی آگے بڑھ کر غیر عرب مسلمان حکومتوں کو بھی اس فیڈریشن میں شامل ہونے کی دعوت دیں۔ حزب التحریر کا یہی موقف ہے جس کی بنا پر وہ عرب دنیا کی بائیں اور دائیں دونوں بازوؤں کی حکومتوں کی نظر میں یکساں طور پر معتوب ہے۔ تقریباً تمام عرب ممالک میں اسے خلافِ قانون قرار دیا جا چکا ہے، اور آئے دن اس کے ارکان کی گرفتاریاں عمل میں آتی رہتی ہیں۔ لبنان میں بھی یہ پارٹی خلافِ قانون ہے، اس کے متعدد ارکان زیرِ حراست ہیں۔ حزب التحریر محض پروپیگنڈے اور تبلیغ پر ہی اکتفا نہیں کرتی، بلکہ اپنے نظریات کو عملی جامہ پہنانے کے لیے "عملی اقدامات" بھی کرتی رہتی ہے۔

بیروت کے سیاسی حلقے اس امر پر تعجب کا اظہار کر رہے ہیں کہ حزب التحریر جو اردن میں ایک مدت سے خلافِ قانون ہے، قوت اور اثر و رسوخ کے اعتبار سے بھی کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی، اتنی بڑی سازش کرنے پر کس طرح تیار ہو گئی۔ یہاں کے ایک اخبار نے لکھا ہے کہ عالمِ عرب کی دائیں بازو کی حکومتوں نے بھی ناپسندیدہ افراد کی تطہیر کرنے کے لیے وہی طریقے اختیار کرنے شروع کر دیے ہیں، جو یہاں کی بائیں بازو کی حکومتیں اکثر آزماتی رہتی ہیں۔ شام، عراق اور مصر میں تو یہ ڈرامہ تقریباً ہر ماہ کھیلا جاتا ہے۔

٤

لیبیا کی نئی حکومت نے ایک آرڈیننس کے ذریعے شراب کی خرید و فروخت پر مکمل پابندی عائد کر دی ہے۔ اس سے قبل یہاں شراب کی خرید و فروخت عام تھی اور اس پر کسی طرح کی پابندی نہ تھی۔ بالعموم ہر جنرل سٹور اور پروویژن سٹور میں شراب فروخت کی جاتی تھی۔

*

لیبیا کی غیر ملکی تیل کمپنیوں کے ماہرین کی جو بالعموم صحراؤں میں اکیلے رہتے ہیں، شراب کے بغیر زندگی اجیرن ہو جائے گی۔ تاہم حکومت نے ابھی تک اس احتجاج کا نوٹس نہیں لیا۔

ایک اور آرڈیننس کے ذریعے نئی حکومت نے ملک کے ابتدائی مدارس میں عربی کے علاوہ دیگر تمام غیر ملکی زبانوں کی تعلیم ممنوع قرار دے دی گئی ہے۔ اس سے قبل لیبیا کے ابتدائی مدارس میں انگریزی اور اطالوی زبانیں لازمی مضامین کی حیثیت سے پڑھائی جاتی تھیں۔ اس حکم میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ انگریزی اور اطالوی زبانوں میں لکھے جانے والے تمام سائن بورڈ اور اعلان فوری طور پر ہٹا لیے جائیں اور ان کی جگہ عربی زبان میں سائن بورڈ اور اعلانات لکھے جائیں، چنانچہ گذشتہ بدھ کو ملک کے دارالحکومت میں انگریزی اور اطالوی زبانوں میں لکھے ہوئے تمام سائن بورڈ ہٹا لیے گئے یا ان پر سیاہی پھیر دی گئی۔ اس حکم پر اس قدر سختی سے عمل کرایا گیا کہ لیبیا کے سب سے بڑے پیلس ہوٹل میں LADIES اور GENTLEMEN کے الفاظ بھی مٹا دیے گئے اور ان کی جگہ "السیدات" اور "الرجال" لکھ دیے گئے۔ ہوٹل کی لفٹ کے دروازے پر اطالوی میں "IN ARRIVO" کا ایک چھوٹا سا سائن بورڈ لفٹ کو بلانے کے لیے لگا ہوا تھا۔ اس پر اب کالے رنگ کا کاغذ لگا دیا گیا ہے۔ سڑکوں پر سے "NO PARKING" اور "BUS STOP" کے بورڈ بھی ہٹا دیے گئے ہیں اور ان کی جگہ عربی عبارتیں لکھ دی گئی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ٹریپولی کے خوبصورت شہر میں اس وقت انگریزی زبان میں صرف ایک ہی سائن بورڈ ہے، جو ایئرپورٹ سے آنے والی شاہراہ پر ہے اور اس کا خطاب غیر ملکی لوگوں سے ہے:

"YOU ARE SAFE IN OUR COUNTRY" ■■

محمد اکرم خان (ایڈووکیٹ)

آزاد کشمیر

آئین سازی کی تیاریاں

آزاد کشمیر میں خان عبدالحمید خاں کے مستعفی ہوجانے کے بعد بریگیڈیر عبدالرحمٰن خان قریشی کی حکومت قائم ہوگئی ہے۔ اس حکومت میں تین بڑی سیاسی جماعتوں، مسلم کانفرنس، لبریشن لیگ اور آزاد مسلم کانفرنس کے وزراء عبداللہ شاہ آزاد، راجہ ذوالقرنین اور سید نذیر حسین شاہ نے حلفِ وفاداری اٹھالیا ہے اور ان کو مختلف محکمہ جات بھی تفویض کر دیئے گئے ہیں۔

اتحادِ ثلاثہ کے تینوں رہنما سردار عبدالقیوم خان، مسٹر کے۔ ایچ خورشید اور سردار محمد ابراہیم خاں اس حد تک خوش ہیں کہ نئی حکومت میں ان کے نمائندے لے لیے گئے ہیں اور یہ کہ دس ماہ بعد موجودہ عبوری حکومت نیا آئین بنا کر مستعفی ہوجائے گی اور انتخابات کے نتیجے میں نئی منتخب اور عوامی حکومت بن جائے گی۔ انتخابات کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ بالغ رائے دہی کی بنیاد پر کرائے جائیں گے، جن میں آزاد کشمیر کے عوام اور کشمیری مہاجرین مقیم پاکستان، آزاد کشمیر کی اسمبلی کے لیے جو غالباً چالیس افراد پر مشتمل ہوگی، ووٹ دیں گے۔ نئے صدر کے بارے میں قیاس کیا جارہا ہے کہ انہیں نئی منتخب شدہ اسمبلی کے ممبران منتخب کریں گے۔

وادیٔ کشمیر اور جموں کے لوگ اور ضلع مظفر آباد کے عوام اس لحاظ سے ناخوش ہیں کہ کابینہ میں ان کا کوئی نمائندہ نہیں لیا گیا۔ جب میں نے سردار عبدالقیوم خاں سے اس بارے میں شکایت کی تو انہوں نے بتایا کہ اتحادِ ثلاثہ کے رہنماؤں نے اپنے نمائندے دیتے وقت صوبۂ جموں اور وادیٔ کشمیر کے نقطۂ نظر سے نہیں سوچا۔ میں نے سردار عبدالقیوم خاں سے کہا کہ اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ موجودہ حکومت اگست ۱۹۷۰ء تک ہی کام کرے گی۔ انہوں نے بتایا کہ چیف ایڈوائزر صاحب نے انہیں یقین دلایا ہے اور موجودہ صدرِ حکومت نے بھی اعلان کر دیا ہے کہ وہ آئین بنا کر مستعفی ہوجائیں گے۔ میں نے کہا کہ خان عبدالحمید خاں کی حکومت کے بارے میں بھی یقین دلایا گیا تھا کہ عبوری ہے اور صرف چھ ماہ کے بعد مستعفی ہوجائے گی، جب کہ وہ چھ سال تک کام کرتی رہی۔ سردار صاحب نے کہا آگے چل کر دیکھ لیں گے۔

آج کل سب سے زیادہ اہم معاملہ آئین کا ہے۔ آزاد کشمیر کا آئین اگست ۱۹۷۰ء سے پہلے بن جائے گا اور اس کے تحت انتخابات ہوں گے یا نہیں؟ یہ ایک علحدہ سوال ہے۔ ہم اس وقت صرف اس امر پر بحث کریں گے کہ آزاد کشمیر کا نیا آئین کیسا ہونا چاہیے؟

اس سوال کا جواب دینے سے پہلے آئین کی تاریخ کا سرسری سا جائزہ لینا ہوگا۔ ڈوگرہ راج میں آئین ایکٹ ۱۹۳۴ء کے تحت ریاستِ جموں و کشمیر میں ایک اسمبلی تھی جس کے اکثر ممبر منتخب ہوا کرتے تھے۔ ۱۹۴۷ء کے انقلاب سے قبل اس اسمبلی سے دو وزیر کابینہ میں لیے جاتے تھے، جو اسمبلی کے سامنے جواب دہ ہوتے تھے۔ باقی وزراء کو مہاراجہ بہادر خود نامزد کرتے تھے۔

۱۹۴۷ء میں انقلاب آیا۔ ۲۴ر اکتوبر ۱۹۴۷ء کے اعلامیے کی رُو سے مہاراجہ ہری سنگھ کو معزول کر دیا گیا۔ آزاد کشمیر میں نئی حکومت قائم ہوئی جو عوام کے سامنے جواب دہ ظاہر کی گئی۔ جب جنگ بند ہوئی اور قائدِ ملت جناب چودھری غلام عباس خاں مرحوم مقبوضہ کشمیر سے نکل کر پاکستان پہنچے، تو انہوں نے حکومتِ پاکستان پر زور دیا کہ آزاد کشمیر کی سرزمین بے آئین ہے، کوئی قابلِ قبول آئین ہونا چاہیے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پاکستان کا اپنا آئین بھی نہ بنا تھا۔ بہرحال شیخ عبدالحئی (موجودہ ایڈووکیٹ مظفر آباد) نے، جو اس وقت ڈپٹی سیکرٹری جنرل آزاد کشمیر حکومت تھے، آئین کے دو مسودے تیار کیے۔ ایک مسودہ سردار محمد ابراہیم خاں (صدرِ حکومتِ وقت) کو دے دیا اور دُوسرا قائدِ ملت چودھری غلام عباس خاں کو خاموشی سے تھما دیا۔ چودھری صاحب مرحوم نے لیاقت علی خاں وزیرِ اعظم پاکستان سے بات چیت کی اور حکومتِ پاکستان سے یہ اصول منوا لیا کہ آزاد کشمیر کی حکومت تحریکِ آزادیٔ کشمیر کے سربراہ کے سامنے جواب دہ ہوگی اور تحریک کے سربراہ صدرِ حکومت کو مقرر کیا کریں گے۔ پاکستان کے مفادات کو محفوظ رکھنے کے لیے ایک انتظامی مشیرِ اعلیٰ (چیف ایڈمنسٹریٹو ایڈوائزر) کی تقرری پر اتفاق کر لیا گیا، جو آزاد کشمیر حکومت کو مشورے دیا کریں گے اور آزاد کشمیر کے ملازموں پر کنٹرول بھی کریں گے۔ اس آئین کو ۱۹۵۰ء کے رولز آف بزنس کا نام دیا گیا اور یہ آئین ۲۸ر دسمبر ۱۹۵۰ء کو بحکم چودھری غلام عباس بحیثیت سپریم ہیڈ تحریکِ آزادیٔ کشمیر نافذ کیا گیا۔ اس کے قاعدہ نمبر ۵ کی رُو سے:۔

"سپریم ہیڈ، صدر اور کونسل کے دیگر وزراء کو نامزد کرے گا اور ان کو محکمہ جات تفویض کرے گا۔"

قاعدہ نمبر ۶ کی رُو سے:۔

"کونسل اجتماعی طور پر آزاد کشمیر کے انتظام کے بارے میں سپریم ہیڈ کے سامنے جواب دہ ہوگی اور اس کی خوشنودی تک اپنے عہدے پر فائز رہے گی۔"

قاعدہ نمبر ۱۱ کی رُو سے:۔

"قانون سازی کا اختیار کونسل کو ہوگا۔ سپریم ہیڈ قوانین کے بارے میں جو اس کے سامنے پیش کیے جائیں، ترامیم کی سفارش کر کے کونسل کے پاس برائے غور بھیج سکتا ہے۔"

قاعدہ نمبر ۹ کی رُو سے:۔

"چیف جسٹس اور جج صاحبان عدالتِ عالیہ آزاد کشمیر کی تقرری سپریم ہیڈ کرے گا اور وہ اس کی خوشنودی تک اپنے فرائض سرانجام دیں گے۔"

قاعدہ نمبر ۱۰ کی رُو سے چیئرمین و اراکین پبلک سروس کمیشن کی تقرری بھی سپریم ہیڈ کے اختیار میں دی گئی۔

۱۹۴۷ء سے لے کر آج تک صرف ۱۹۵۰ء کا آئین ہی واحد آئین ہے جو عوام کی مرضی سے نافذ کیا گیا۔ بدقسمتی سے یہ آئین صرف دو سال تک چل سکا۔ وزارتِ امورِ کشمیر نے چودھری غلام عباس خاں اور سردار محمد ابراہیم خان میں پھوٹ ڈلوا دی۔ مقصد یہ تھا کہ کسی طرح سے ۱۹۵۰ء کے رُولز آف بزنس کو ختم کر کے زیادہ سے زیادہ اختیارات وزارتِ امورِ کشمیر کے سپرد کیے جائیں۔ چنانچہ ۲۸ر اکتوبر ۱۹۵۲ء کو بحکم بشیر احمد خاں صدرِ آزاد کشمیر حکومت، نظرِ ثانی شدہ رُولز آف بزنس نافذ کیے گئے جن کی رُو سے سپریم ہیڈ کا عہدہ ختم کر دیا گیا اور اعلان کیا گیا کہ آزاد حکومت کا:

(ا) صدر اپنا عہدہ جنرل کونسل آل جموں و کشمیر مُسلم کانفرنس (جسے مناسب طور پر حکومتِ پاکستان کی وزارتِ امورِ کشمیر تسلیم کرے گی) کی خوشنودی تک سنبھالے رہے گا۔

(ب) وزراء اپنے عہدوں پر صدر کی خوشنودی تک فائز رہیں گے۔

(قاعدہ ۵) وزارتِ اُمورِ کشمیر کو عدلیہ اور قانون

سازی پر بھی بالادستی حاصل ہوگی۔

(قواعد ۹۶) پبلک سروس کمیشن کے صدر اور عدالت العالیہ کے جج صاحبان کے تقرر میں بھی وزارتِ امورِ کشمیر کا مشورہ لازمی قرار دیا گیا۔

وزارتِ امورِ کشمیر نے کبھی آل جموں و کشمیر مسلم کانفرنس کی جنرل کونسل کو طلب نہیں کیا؛ تاہم وزارتیں بنتی اور بگڑتی رہیں۔ مسلم کانفرنس کی مجلس عاملہ سے کبھی کبھار انگوٹھے لگوا لیے جاتے تھے۔ ان ترمیم شدہ رُولز آف بزنس کے خلاف چودھری غلام عباس مرحوم نے میرپور کے مقام پر ایک تاریخی کونشن طلب کیا، لیکن پاکستان کے وسیع تر مفادات کے پیشِ نظر چودھری صاحب مرحوم نے ایجی ٹیشن کرنے سے گریز کیا۔ جب چودھری حمیداللہ خان مرحوم کو وزارت سے برطرف کیا گیا، تو انہوں نے اپنی برطرفی پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا:

"وزارتِ اُمورِ کشمیر کا ایک معمولی کلرک بھی صدرِ آزاد کشمیر حکومت سے زیادہ اختیارات رکھتا ہے۔"

۱۹۵۸ء میں بحکم سردار محمد ابراہیم خان صدرِ حکومت مورخہ ۲۹ نومبر ۱۹۵۸ء نئے نظرِ ثانی شدہ رُولز آف بزنس کا اعلان کیا گیا؛ جس کے ضمیمہ اول کے آرٹیکل ۴ کی رُو سے جو اختیارات ۱۹۵۲ء کے آئین کی رُو سے جائنٹ سیکرٹری وزارتِ اُمورِ کشمیر کو حاصل تھے، چیف ایڈوائزر کو تفویض کیے گئے اور چیف ایڈوائزر صاحب بہادر کے اختیارات میں بے حد اضافہ کیا گیا۔ ایک لاکھ روپے سے زیادہ کے محکمہ جنگلات اور تعمیراتِ عامہ کے ٹھیکہ جات کی منظوری بھی چیف ایڈوائزر کے اختیار میں دے دی گئی۔ ڈیڑھ سو روپے تک کی اسامی کی منظوری بھی وزارتِ امورِ کشمیر کے تابع کر دی گئی۔

۱۹۵۸ء سے قبل سردار عبدالقیوم خان کی حکومت کی تشکیل کے وقت جنرل کونسل مسلم کانفرنس کو طلب کیا گیا تھا اور اس طرح سے پہلی بار عوام کی رائے لی گئی، لیکن یہ چودھری محمد علی وزیرِ اعظم پاکستان کا کرم تھا۔ جب چودھری محمد علی کی وزارت ختم ہوئی، تو سردار عبدالقیوم کی وزارت بھی اپنی کشمکش کے نو ماہ پورے کرنے کے بعد سہروردی صاحب کی نظرِ بد کا شکار ہو گئی۔

سردار عبدالقیوم خان کی وزارت کے علاوہ ۱۹۶۰ء میں پھر ایک بار عوام سے استصوابِ رائے کیا گیا، لیکن بنیادی جمہوریتوں کے ذریعے سے اس سلسلے میں آزاد جموں و کشمیر صدارتی الیکشن ایکٹ ۱۹۶۰ء اور آزاد جموں و کشمیر مہاجرین رجسٹریشن و نمائندگی ایکٹ ۱۹۶۰ء کا ذکر ضروری ہے۔ مسٹر کے ایچ خورشید نے صدرِ منتخب ہونے کے بعد جب وزارت امورِ کشمیر کو آنکھیں دکھانا شروع کیں اور آزاد کشمیر حکومت کو تسلیم کرانے کا نعرہ لگایا، تو سٹیٹ کونسلروں کی اکثریت کی تائید حاصل ہونے کے باوجود ان کی صدارت برقرار نہ رہ سکی۔ وزارتِ امورِ کشمیر نے اپنی نظرِ انتخاب جناب خان عبدالحمید خان پر ڈالی جو اس وقت عدالت العالیہ کے رئیس (چیف جسٹس) تھے۔ ۲۰ اگست ۱۹۶۴ء کو آزاد جموں و کشمیر گورنمنٹ ایکٹ ۱۹۶۴ء نافذ ہوا جس کی دفعہ ۴ کی رُو سے:

(۱) چیف ایڈوائزر سٹیٹ کونسل کے ممبران میں سے کسی ایک کو اس کا چیئرمین مقرر کریں گے جب تک وہ کسی دوسرے شخص کو چیئرمین مقرر کرنا مناسب نہ سمجھیں، بشرطیکہ اگر ایسا مقرر کردہ چیئرمین تحت زیرِ دفعہ ۳ سٹیٹ کونسل کا ممبر نہ ہو، تو ایسے شخص کو اس دفعہ میں مذکورہ ممبران کے علاوہ ایسا ممبر تصور کیا جائے گا۔

(۲) چیئرمین اُس عرصے تک اپنے عہدے پر قائم رہے گا جس کا تعین ایڈوائزر کرے گا اور اگر مدّت کا تعین نہ کیا جائے، تو پھر ایڈوائزر کے آئندہ احکام تک وہ اپنے عہدے پر فائز رہے گا۔

ایکٹ ۶۴ کے بعد آزاد جموں و کشمیر حکومت ایکٹ ۱۹۶۸ کا ظہور ہوا جس کی رُو سے ریاستی کونسل کے چیئرمین کو (X-OFFICIO) صدر حکومتِ آزاد کشمیر بنایا گیا۔

دفعہ ۱۴ کی رُو سے:

چیئرمین اپنے عہدے پر فائز ہونے کی تاریخ سے پانچ سال کی مدّت تک برقرار رہے گا۔ وہ اپنے عہدے کی میعاد کے اختتام کے باوجود اس وقت تک اپنے عہدے پر فائز رہے گا جب تک کہ اُس کا جانشین یہ عہدہ نہیں سنبھال لیتا۔

عبدالرحمان خان - صدر آزاد کشمیر

دفعہ ۱۵ کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

(۱) اگر صدر کا عہدہ بصورت وفات، استعفیٰ یا کسی اور وجہ سے خالی ہو جائے، تو اس عرصے میں چیف ایڈوائزر دفعہ ۹۔ سٹیٹ کونسل کے مشورے سے ان ممبران میں سے کسی کو چیئرمین کے عہدے کے لیے نامزد کرے گا تاوقتیکہ نیا منتخب شدہ چیئرمین اپنے عہدے کو سنبھال نہیں لیتا اور

ب۔ عہدے کے اس طرح خالی ہو جانے کے آٹھ ہفتوں کے اندر اندر قاعدے کے مطابق چیئرمین کے انتخاب کے بارے میں انتظامات کرے گا، بشرطیکہ ایسے الیکشن سے قبل سٹیٹ کونسل میں خالی جگہ کو قاعدے کے مطابق پُر کر دیا جائے گا۔

۲ اس طرح منتخب شدہ چیئرمین باقی ماندہ معیاد، جو اُس کے مقدم جانشین کی رہتی ہے، کے لیے عہدے پر فائز رہے گا۔

اس ایکٹ میں چیف ایڈوائزر کو گورنر کے تمام اختیارات دیئے گئے ہیں۔ دفعہ ۱۹ کے تحت چیف ایڈوائزر صاحب جب چاہیں گورنمنٹ کو نوٹس دے دیں کہ ہنگامی حالت پیدا ہو گئی ہے وہ سٹیٹ کونسل کو معطل کر سکتے ہیں یا توڑ سکتے ہیں اور جس شخص کو چاہیں صدر کے طور پر متعین کر سکتے ہیں۔

ایکٹ ہذا کی دفعہ ۸ میں جن معاملات کو محفوظ (RESERVED) قرار دیا گیا ہے ان میں اس قانون کی دفعات یا اس قانون کے تحت قواعد بھی ہیں۔ گویا سٹیٹ کونسل اس ایکٹ کو اپنے کسی اجلاس میں زیرِ بحث ہی نہیں لا سکتی۔

اس ایکٹ کا اعلان خان عبدالحمید خان صدرِ حکومت نے ۱۷ ستمبر ۱۹۶۸ء کو کیا۔ آزاد کشمیر کی تینوں بڑی سیاسی پارٹیوں کی زبردست مخالفت کے باوجود یہ قانون معرضِ وجود میں آ گیا۔

اب نئے صدر نے آئین مرتب کرنے کی اہم ذمہ داری قبول کر لی ہے۔ ہم نہایت ہی مؤدبانہ طور پر گذارش کرتے ہیں کہ سابقہ تجربات کو مدِنظر رکھتے ہوئے آزاد کشمیر حکومت کو عوام کے سامنے جواب دہ بنایا جائے۔

جس طرح پاکستان کے اکثر سیاسی رہنما حکومتِ پاکستان پر زور دے رہے ہیں کہ ۱۹۵۶ء کا آئین بحال کر دیا جائے اسی طرح سے ہم یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ ۱۹۵۰ء کا آئین مناسب ترامیم کے ساتھ بحال کر دیا جائے۔ اگر نئی منتخب شدہ اسمبلی ۱۹۵۰ء کے رولز آف بزنس میں کوئی ترمیم یا تنسیخ کرنا چاہے تو اسے اس کا اختیار دیا جا سکتا ہے لیکن جب ایک قابلِ قبول دستاویز ہمارے پاس پہلے سے موجود ہے تو کیوں نہ اس سے فائدہ اٹھایا جائے اور ایک اچھا آغاز کیا جائے۔

راولپنڈی

اجنبی نوجوان نے جلسہ لُوٹ لیا

ناصر عباس

پچھلے ہفتے شاعرِ پوٹھوہار عبدالعزیز فطرتؔ مرحوم کی دوسری برسی منائی گئی۔ راولپنڈی کے تمام معروف اہلِ قلم کا ایک نمائندہ اجلاس میجر سید ضمیر جعفری کی صدارت میں ہوا جس میں صاحبِ صدر کے علاوہ امین راحتؔ، پروفیسر کرم حیدری، جمیل ملک، عطا حسین کلیم اور عزیز ملک نے فطرتؔ مرحوم کی شخصیت اور فن پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ عزیز ملک نے مرحوم شاعر کی ادبی خدمات کے پس منظر میں پنڈی شہر کے علمی و عمومی مزاج کا ذکر کرتے ہوئے تاریخی نوعیت کا ایک واقعہ بیان کیا جو قارئین کی دلچسپی کے لیے درج کیا جاتا ہے۔

۱۹۱۴ء کی جنگِ عظیم کے دوران سرکارِ برطانیہ کی ناؤ بھنور میں پھنس گئی تھی۔ انہی دنوں ملک گیر پیمانے پر یہ تحریک چل رہی تھی کہ "فوج اور پولیس کی نوکری قطعی حرام ہے۔" عوام الناس اس نعرے سے متاثر تھے۔

ان دنوں خطۂ پوٹھوہار بازوئے شمشیر زن کی حیثیت رکھتا تھا۔ بھرتی کے کام میں رکاوٹ سے انگریزوں کو بجا طور پر تشویش لاحق تھی، چنانچہ مسلمانوں کو حکومتِ وقت کی وفاداری کی تلقین کرنے کے لیے مہم چلائی گئی۔ اس مہم کے دوران تعلیمی کانفرنسیں بھی منعقد کی جاتیں۔ یہ کانفرنسیں علی گڑھ کی مرکزی مجلسِ انتظامیہ کے تحت ہوا کرتی تھیں۔ ۱۶ء کی سالانہ کانفرنس یوپی کے کسی شہر میں ہونے والی تھی۔ حکومت نواز طبقے کو خیال ہوا کہ اگر امسال یہ کانفرنس پنڈی میں ہو تو ہر لحاظ سے مفید نتیجہ نکلے گا۔ اس وقت تعلیم سے زیادہ فوجی بھرتی کا مسئلہ پیشِ نظر تھا۔ مفاد پرست لوگ یہ کہتے کہ ہندوؤں نے چالاکی سے کام لے کر مسلمانوں پر معیشت کے دروازے بند کرنے اور فنِ حرب و ضرب سیکھنے سے محروم رکھنے کے لیے "فوج کی نوکری حرام ہے" کا نعرہ لگوایا ہے۔ اس طلسم کو توڑنے کی خاطر تعلیمی کانفرنس کا سٹیج استعمال کرنا ضروری ہے۔ اس اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کے لیے قاضی سراج الدین بیرسٹر مرحوم کی قیادت میں ایک وفد علی گڑھ گیا اور کارپردازانِ مجلس کو قائل کر دیا کہ اس سال یہ کانفرنس اگر پنڈی میں ہو تو علی گڑھ تحریک کا تعارف اور اس کے مقاصد کی تبلیغ کے ساتھ خاطر خواہ چندہ بھی جمع ہو جائے گا۔

تجویز منظور ہو گئی۔ کانفرنس کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ حکومت نے کماحقہ امداد کی اور وقت کی کمی کے باوجود شاندار پیمانے پر سب انتظامات مکمل ہو گئے۔ باہر سے علمائے کرام، شیریں مقال واعظ اور خوش الحان نعت خواں درآمد کیے گئے۔

حریت پسند مسلمان بھی غافل نہیں تھے۔ انہوں نے علی برادرانؒ اور مولانا ابوالکلام آزادؒ سے خط و کتابت کی اور اصل حقیقت سے باخبر کر دیا۔ کانفرنس کے انعقاد کا دن آپہنچا۔ پہلا اجلاس شروع ہوا تھا کہ چشمِ فلک نے نرالا منظر دیکھا۔ ایک تانگہ اسکول کے باہر آکر رکا۔ تین اصحاب اتر کر پنڈال کے صدر دروازے کی سمت بڑھے اور ٹکٹ خرید کر قدم بہ قدم چلتے ہوئے سٹیج کی نشستوں پر جا کر بیٹھ گئے۔ ان تینوں کے چہرے مہرے اور لباس نے حاضرین کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ یہ علی برادرانؒ اور مولانا ابوالکلام آزادؒ تھے۔ ان کے ناموں سے اخباربین طبقہ بخوبی آشنا تھا، مگر پنڈی کے بہت کم لوگوں نے اس سے پہلے انہیں دیکھا تھا۔ بہرحال جب کچھ لوگوں نے پہچان لیا تو انہوں نے ساتھ والوں سے کہا اور ساتھ والوں نے آگے نشر کر دیا۔ پنڈال میں جوش و خروش پھیل گیا۔ پنڈی والے "زندہ باد" کا نعرہ بہت جلد لگاتے ہیں اور دل کو گرما دینے والی تقریریں سننے کا بھی بے تحاشہ ذوق رکھتے ہیں۔ اس وقت جو صاحب تقریر کر رہے تھے انہیں بات کہنا مشکل ہو گئی۔ اجلاس کے رنگ میں بھنگ پڑ گئی۔ منتظمینِ جلسہ کے حواس باختہ ہو گئے۔ حاضرین مولانا آزادؒ کو سننا چاہتے تھے اور منتظمین اس رُخ پر آ نہیں رہے تھے۔ جب ہاؤ ہو کا شور حد سے بڑھا تو قاضی سراج الدین مرحوم نے لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کی کہ جلسے کو پروگرام کے مطابق چلنے دیں اور اگر وقت ہوا تو آخر میں مولانا محمد علی جوہرؒ اور مولانا آزادؒ کو بھی موقعہ دیا جائے گا۔ مگر سامعین کب مان کر دیتے تھے۔ تمنا بے تاب ہو گئی، کچھ منچلوں نے شامیانوں کی طنابیں ڈھیلی کر دیں۔ آخر کار سٹیج والے مجبور ہو گئے کہ طے شدہ پروگرام کو فسخ کر کے مولانا آزادؒ سے ان کے ارشادات سننے کی درخواست کریں۔

مولانا کھڑے ہوئے اور "توحید" کے موضوع پر تقریر شروع کی۔ پنڈی میں ان کی یہ پہلی تقریر تھی۔ رات کا سناٹا اور مولانا کی آتش نوائی، سامعین کی رگوں میں لہو گرما گیا۔ ہواؤں کا رُخ ایسا پلٹا کہ فوجی بھرتی کا بُھرتہ ہو گیا۔

اگلے روز قبلِ دوپہر دوسری نشست تھی۔ جلسہ ابھی شروع نہ ہوا تھا کہ انگریز کمشنر مسٹر پالم ینگ اور ان کی دخترِ نیک اختر بھی تشریف لائے۔ سٹیج پر لیڈرانِ کرام سے ان کا تعارف کرایا گیا۔ دخترِ افرنگ کے سفید فام ہاتھوں میں پھولوں کا گلدستہ تھا، جو اس نے ابوالکلام آزاد کو پیش کر دیا ؎

الٰہی کو شبِ مہتاب و ذوقِ مے پرستیہا
بدستے دستۂ نرگس بدستِ ماہرو دستے (گرامی)

یاد رہے یہ وہ دور ہے جب مولانا آزاد کہا کرتے تھے۔
ع دنیا جوان تھی میرے عہدِ شباب میں

آزادؔ نے گلدستے کو ہونٹوں کے قریب لا کر غالبؔ کا یہ شعر پڑھا ؎

اے بادِ صبح عطرے ازاں پیرہن بیار
تسکیں ز بوئے گل نہ پذیرد مشامِ ما

پھولوں کی مہک پارہ پارہ ہو کر پھیل گئی۔ پورا سٹیج تبسم زار بن گیا، مگر دوشیزۂ مغرب کچھ سمجھ نہ پائی۔ مولانا محمد علی جوہرؒ نے شعر کا انگریزی ترجمہ کیا، جسے سُن کر دُور دیس کی الہڑ جوانی جھوم گئی اور التجا کی کہ ان لیڈروں کے آٹوگراف، فارسی شعر اور اس کا انگریزی ترجمہ اسے لکھ کر دیا جائے، چنانچہ اس کی یہ التجا پوری کر دی گئی۔ ——

انگلستان میں

پاکستانی مصنوعات، کریانے کا سامان، گھریلو استعمال کی چیزیں، تازہ اور ڈبوں میں بند سبزیاں، فروٹ، ساڑھیاں اور ہر قسم کی کتابیں امپورٹ کرنے والے ......

گراموفون کمپنی لمیٹڈ پاکستان کے فلمی ریکارڈ انگلستان کے لیے امپورٹ کرنے والے ......

پاکستان کا ممتاز ماہنامہ "اردو ڈائجسٹ"، ہفت روزہ "زندگی" اور سب مشہور رسالے امپورٹ کرنے کے سول ایجنٹ:

اقبال کمپنی لمیٹڈ لندن

IQBAL CO. LIMITED
SHALAMAR HOUSE
HESSEL STREET, LONDON E.1
TELEPHONES–
01-709144 AND 01-709145

مجیب الرحمٰن شامی

لاہور

مفتی محمود کا سانپ کچلا گیا

مولانا احتشام الحق آج کل پورے ملک کا طوفانی دورہ کر رہے ہیں۔ بجلی کی سی تیزی سے آتے، قلب و نظر کو روشنی دیتے اور پھر آنکھ جھپکتے میں لوٹ جاتے ہیں۔ آج پشاور ہیں تو کل ملتان، پرسوں لائل پور، ــــ ایک دن ملتان سے ان کی تقریر کی خبر آتی ہے، دوسرے دن پشاور سے، تیسرے دن مردان سے ــ ایسے ہی لاہور بھی آئے۔ یہاں دو جلسوں سے خطاب کیا اور پھر ہوٹل ایمبیسیڈر میں شہریوں سے ملاقات کی، ہوٹل ایمبیسیڈر میں اسلام کے اِس "ایمبیسیڈر" کو بلانے کا اہتمام جنابِ ذکی نے کیا، جو مفتی محمد شفیع کے صاحبزادے ہیں اور لاہور کی مرکزی جمعیت العلمائے اسلام کے نائب صدر بھی۔ مولانا بمشکل دو منٹ بولے، پھر کہنے لگے: "آیئے اب چائے پیتے ہیں، کوئی محفل تو ایسی ہونی چاہیے، جس میں تقریر کے بغیر چائے کا لطف لیا جائے۔" مولانا سے خاصی گفتگو رہی۔ ایک شہر (شاید مردان) کا حال سناتے ہوئے کہنے لگے: "وہاں میرے پاس ایک طالب علم آیا اور مجھ سے سوشلزم اور اسلام کا فرق سمجھانے کو کہا، میں نے خوب اچھی طرح سوشلزم کے عیوب اس پر آشکارا کیے، وہ میری باتیں سنتے ہی ایمان لے آیا، اپنی جیب سے بھٹو کی تصویر نکال کر پھاڑ ڈالی اور کہنے لگا: میں آپ کے ہاتھ پر توبہ کرتا ہوں۔ اس کے بعد وہ اپنے ساتھیوں کے پاس گیا اور انہیں بھی خوب اچھی طرح سمجھایا۔ ان سب نے بھی سوشلزم سے توبہ کر لی۔" ــ مولانا کی رائے تھی کہ بہت سے نوجوان محض فیشن میں سوشلسٹ بن گئے ہیں، ان کو اس کی خبر ہی نہیں کہ اسلام سے یہ نظام کیونکر متضاد ہے۔ اگر علماء گاؤں گاؤں پہنچ کر دلیل کے ہتھیار سے لیس ہو کر بات کریں، تو اللہ کے فضل سے یہ نوجوان اپنے دین پر لوٹ آئیں گے ــــ گفتگو ہو مولانا احتشام الحق سے مسئلہ ہو سوشلزم کا اور غلام غوث ہزاروی اور مفتی محمود کا ذکر نہ آئے، یہ ناممکن نہیں محال ہے۔ مفتی محمود کے ذکر کے ساتھ ہی مولانا تھانوی کے اس جلسے کی یاد تازہ ہو گئی، جو آج سے کئی دن پہلے ملتان میں ہوا تھا اور اس میں مفتی محمود کے حامیوں نے سانپ چھوڑ دیا تھا۔ مولانا تھانوی دوبارہ ملتان گئے تو انہوں نے کیا کہا؟ ان کی زبان ہی سے سنیئے:

"میں نے دوسری بار جلسے سے خطاب کرتے ہوئے کہا، پچھلی دفعہ یہاں ایک سانپ نکل آیا تھا۔ امید ہے آپ اس کا سر اچھی طرح کچل چکے ہوں گے اور اب وہ سانپ دوبارہ سر نہ اٹھا سکے گا۔"

تھانوی صاحب کی بات تو درست ہے، لیکن انہوں نے آستین کے سانپوں پر شاید اس لیے روشنی نہیں ڈالی کہ انہیں مفتی محمود پر ذاتی حملہ کرنا پسند نہیں۔

۲

ہم نے سن رکھا تھا کہ حضرتِ قاسمی "عنقا" کا بھیس بدل کر امروز میں "حرف و حکایت" لکھتے ہیں، جنابِ عنقا ہم سے الجھے تو ہم نے بھی ان کی خدمت میں چند کچی باتیں عرض کر دیں، لیکن یہ حضرت ہمیں الٹی سیدھی سنانے پر اتر آئے ہیں، وہ ہمیں اچھی طرح سمجھ کر پکار اٹھے ہیں کہ ہمیں اخلاق اور تمیز کا پاس نہیں ــــ ہم نے حضرتِ قاسمی کو "مولانا" لکھ دیا تھا، وہ اس پر ناراض ہوئے کہ میرے نام کے ساتھ مولانا کیوں لکھا، یہ تو بہت عزت کا لفظ ہے۔ اب انہیں کون سمجھائے کہ حضور آپ کی بھی عزت کی جا سکتی ہے ــــ پھر یہ کہ "امروز" تو ہماری ہمسائیگی میں رہنے والے ایک انکم ٹیکس پریکٹیشنر تمک کو مولانا بنا کر جماعتِ اسلامی کے خلاف اس کا بیان جلی سرخیوں سے شائع کر چکا ہے۔ اس کے علاوہ بھی اس کی ٹکسال سے صدہا داڑھیوں والے بزرگ مولانا بن کر نکلے ہیں، چنانچہ قاسمی صاحب کا استدلال اگر درست سمجھ لیا جائے تو بھی انہیں مولانا کہنے کا جواز پیدا ہو جاتا ہے۔ ان میں باقی تمام صفتیں تو "امروز" کے "مولاناؤں" والی ہیں، صرف داڑھی کی کسر ہے، سو وہ تو کوئی ایسی بات نہیں۔ اگر کسی کی ایک آنکھ، ٹانگ یا کان نہ ہو تو بھی اس کی "آدمیت" میں شبہ نہیں ہو سکتا ــــ اسی طرح "مولانا" قاسمی اگر ایک شرط پوری نہیں کرتے تو کیا ہوا، باقی پانچوں شرعی عیب تو موجود ہیں ــــ ہم یہاں تک لکھ پائے تھے کہ ہمارے ایک دوست آ گئے اور ہمیں مزید لکھنے سے روک دیا، ان کا کہنا تھا کہ یہ جنابِ عنقا احمد ندیم قاسمی قطعاً نہیں ہیں۔ قاسمی صاحب تو بہت معصوم، سمجھدار، مرنجاں مرنج، نیک طینت، بات کو سمجھنے والے اور مزاح کے پھولوں کی خوشبو سے لطف اندوز ہونے والے انسان ہیں۔ عنقا بے چارے کو اس سب سے کیا سروکار؟ یہ عنقا صاحب تو ایسی باتیں لکھ رہے ہیں کہ قاسمی صاحب کی رسوائی ہو رہی ہے۔ یقیناً امروز کے کالم نویس جعلی قاسمی ہیں "نا صلی تے وڈّے" قاسمی صاحب تو اتنے کند ذہن اور حسِ مزاح سے عاری نہیں ہو سکتے ــــ ہم نے یہ "انکشاف" سنا تو بہت خوش ہوئے کہ چلو قاسمی صاحب کے بارے میں ہمارا حسنِ ظن تو برقرار رہا۔ ہمیں امید ہے کہ اصلی قاسمی صاحب ان جنابِ عنقا کے خلاف دعویٰ دائر کر دیں گے تاکہ وہ ان کے نام کو یوں بٹہ نہ لگا سکیں ــ اس امید کے ساتھ ہم اس دفعہ اپنا قلم اس موضوع پر نہیں اٹھا رہے، لیکن اگر قاسمی صاحب نے "عنقا" جی کا نوٹس نہ لیا، تو پھر ہمیں مجبوراً یہ فریضہ ادا کرنا پڑے گا۔

۳

جنابِ شفیع عقیل کراچی کے بزرگ، با اصول اور وضعدار صحافی ہیں۔ ان کی زبان اور قلم میں کبھی دوئی نہیں رہی۔ جسے سچ سمجھا وہی لکھا اور ہمیشہ اس مقولے پر عمل کرتے رہے "جھوٹ لکھنے سے بہتر ہے کہ نہ ہی لکھا جائے" ــ ان سے نظریاتی اختلاف کے باوجود یہ کہے بغیر چارہ نہیں کہ وہ کراچی میں اس روایت کی آخری نشانی ہیں، جسے مولانا غلام رسول مہر، چراغ حسن حسرت، عبدالمجید سالک اور مجید لاہوری نے درخشانی بخشی تھی۔ وہ ادیب پہلے ہیں اور صحافی بعد میں، لیکن ادب اور صحافت دونوں میدانوں میں اپنی مثال آپ۔ پنجابی ادب کی جو خدمت انہوں نے کی ہے اور پنجابی شاعری کو اردو کے حسین قالب میں جس طرح ڈھالا ہے، پنجابی اکیڈمیاں بنا بنا کر بڑی بڑی سرکاری رقوم اینٹھنے والے اصحاب اس مردِ قلندر کی خاک کو بھی نہیں پہنچ سکتے ــــ وہ ترقی پسند رہے، لیکن اس لیے اس ماحول میں رچ بس نہ سکے کہ انہیں صرف اپنی ترقی پسند نہ تھی، وہ پورے معاشرے اور ماحول کی ترقی کے لیے جدوجہد

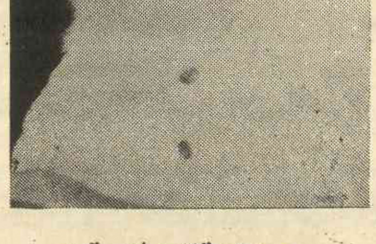

مولانا احتشام الحق تھانوی

کرنے کے درپے تھے۔ اس کا خمیازہ انہیں یہ بھگتنا پڑا کہ بڑی بڑی انجمنیں بنا کر ستائشِ باہمی کرنے والے دانشوروں میں سے کسی کو آج تک شفیع عقیل کی ادبی خدمات پر کوئی مقالہ لکھنے کی توفیق نہیں ہو سکی۔

روزنامہ "جنگ" میں شفیع صاحب کی ایک طویل نظم "جدید ساقی نامہ" نظر سے گذری، پڑھ کر دل جھوم اُٹھا۔ ایک بند قارئینِ "زندگی" کی خدمت میں بھی پیش ہے۔ پڑھیے اور دیکھیے، ہماری سیاسی زندگی کی کیا حقیقی تصویر کھینچی ہے۔ ؎

مرے ساقیا اب تُو جلسے میں جا
جو پُوچھے ہیں تیرے اُنہیں بھی بلا
دھواں دھار ایسی تُو تقریر کر
بسے سُن کے چھلنی ہو جائیں جگر
کبھی مُنہ میں کف بھر کے مکّا دکھا
کسی کو گرا اور کسی کو اُٹھا
پلٹ کر، جھپٹ کر، اِدھر سے اُدھر
کبھی ہاتھ اونچا، کبھی سینے پر
جو آتے ہیں جلسے میں ان کو بنا
کسی کو ہنسا اور کسی کو رُلا
جو مردے گڑے ہیں، انہیں تو اکھاڑ
مخالف ترے ہیں اُنہیں تو پچھاڑ
اگر کوئی بولے، تو دے گالیاں
زبانیں ہوں گوری یا ہوں کالیاں
تجھے کیا کہ جھوٹا یا سچّا ہے تو؟
سیاست میں ماہر یا کچّا ہے تو؟
بیاں دے کہ تیرا یہی کام ہے
اسی سے وطن میں ترا نام ہے
یہاں سے وہاں ہر طرف "ٹور" کر
"ظفر" کا وسیلہ ہے تیرا "سفر"
تُو دعوت اُڑا "کاک ٹیلوں" میں جا
ہوائی سفر کر یا ریلوں میں جا
تری توند میں کچھ کسر نہ رہے
کبھی پھر یہ گنگا بہے نہ بہے
یہی ہے سیاست، یہی طور ہے
نیا ہے زمانہ، نیا دور ہے

--

قارئینِ کرام اپنے مضامین
اس پتے پر بھیجیں:
مدیر ہفت روزہ "زندگی"
سمن آباد، لاہور

ڈھاکہ

مظفر احسن

شیخ مجیب سوشلزم سے توبہ کر لیں گے؟

تعلیمی اداروں میں تعطیلِ خزاں کے سبب طلبہ منتشر ہیں۔ مولانا بھاشانی قرآن کی آیتیں پڑھ پڑھ کر کسانوں کو منظم کر رہے ہیں۔ لال ٹوپی والے کسانوں کی کانفرنس کی تفصیل "زندگی" میں آ چکی ہے۔ ماسکو نواز نیپ کے پروفیسر مظفر احمد نے بھی "یومِ مطالبات" منانے کا اعلان فرما دیا ہے (ہوچی منہ کے تعزیتی جلسے میں وہ ارشاد فرما چکے ہیں کہ سیاست میں اصول پرستی کے برخلاف مقصد برآری اصل چیز ہوتی ہے اور ہوچی منہ کے "اسوۂ حسنہ" سے یہی سبق ملتا ہے)۔

بعض صنعتی اداروں میں مار پیٹ کی دو چار وارداتیں ہو چکی ہیں۔ شیخ مجیب الرحمٰن نے کچھ خارجی اور کچھ داخلی حالات سے مجبور ہو کر مخصوص قسم کے سوشلزم کا نعرہ تو بلند کر دیا تھا، لیکن گوپال گنج میں "عوام" نے ان کا گھیراؤ کر کے جب اس کی وضاحت طلب کی، تو بہت پریشان ہوئے۔ کچھ ہی دن قبل اخبارات میں ان کے نام پوربو پاکستان چھاترو لیگ کے ایک طالب علم کی "کھلی چٹھی" پر گرما گرم صحافتی دنگل ہو چکا تھا۔ معلوم ہوا کہ طفیل گروپ اور مجاہدی گروپ کے علاوہ چھاترو لیگ کے ایک اور گروپ کا ہیولا ابھر رہا ہے۔ پھر پے درپے دو سانحات ایسے رونما ہوئے کہ شیخ صاحب کو "۶۔ دفعہ" کے لیے بڑی فکر لاحق ہوئی۔ ایک تو پی ڈی پی کے عام اجلاس میں شمالی اضلاع کے مندوبین کی طرف سے شمالی صوبے کی تشکیل کا مطالبہ تھا اور دوسرے شاہ پور میں بھاشانی صاحب کا لال ٹوپی والے کسانوں سے خطاب۔ وہاں لال ٹوپی والوں کے اجنبی نعروں نے غیرتِ ایمانی سے سرشار کسانوں میں اشتعال پیدا کیا، تو یہ اس بات کی علامت تھی کہ مشرقی پاکستان کے اصل عوام سوشلزم کی خوراک ہضم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

یہ سارے واقعات اتفاق سے مشرقی پاکستان کے اسی علاقے میں رونما ہو رہے ہیں، جس کو ایک الگ صوبہ بنانے کی تجویز اب نعرہ بن چکی ہے۔ نعروں کے بل پر چلنے والوں کے لیے یہ نیا نعرہ انتہائی تشویشناک ہو تو چنداں موجبِ حیرت نہیں۔ ہندو، بھاشانی اور پروفیسر مظفر احمد کے ہمنوا اس پر مضطرب دکھائی نہیں دیتے، لیکن شیخ مجیب الرحمٰن بوگرہ، راجشاہی، دیناج پور، وغیرہ کے دورے پر روانہ ہو چکے ہیں۔ تقریروں میں انہوں نے اور ان کے ساتھیوں نے بھاشانی اور ان کی گیارہ دفعات پر کھلم کھلا تنقید شروع کر دی ہے۔ اب وہ "سوشلزم" کا نام کم لیتے ہیں اور زیادہ تر ایسے "نظام" کا وعدہ کرتے ہیں جس میں سبھوں کے ساتھ "انصاف" کیا جائے گا۔ وہ اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ شمالی اضلاع کے ساتھ بے انصافیاں ہوئی ہیں اور ان کو نہ صرف یہ کہ پسماندہ رکھا گیا ہے بلکہ بقیہ مشرقی پاکستان سے الگ تھلگ بھی رکھا گیا ہے۔ چنانچہ وہ شمالی بنگال کی صنعتی ترقی کی خاطر روپ پور میں جوہری توانائی کے مرکز کی فی الفور تعمیر پر زور دے رہے ہیں اور اس کے ساتھ ہی ساتھ دریائے جمونا کے آر پار جلد سے جلد پل بنانے کا مطالبہ کر رہے ہیں۔

نیپ ایک نظریاتی تحریک ہے۔ بھاشانی اور مظفر احمد دونوں نے اگر یہ محسوس کیا کہ نظریاتی مقصد برآری کی خاطر مشرقی پاکستان کو دو صوبوں میں تقسیم کرنا برا نہیں رہے گا، تو وہ شیخ مجیب الرحمٰن کو بائیں بازو کا متحدہ محاذ بنانے پر آمادہ کرنے کے لیے اسے بطورِ حربہ استعمال کر سکتے ہیں۔ شیخ مجیب الرحمٰن جانتے ہیں کہ اگر نیپ کی تالیفِ قلب نہ کی گئی، تو وہ انتخابات کا بائیکاٹ کرنے کے لیے نہ صرف نئے نعرے کو استعمال کرا سکتی ہے، بلکہ مہاجر دوستی کا دم بھر کر مہاجرین کی بے چینی سے بھی فائدہ اٹھا سکتی ہے

--

عبدالکریم عابد

کراچی

پاکستان آنے کے لیے جھوٹ بولنا ضروری ہے؟

بھارتی مسلمانوں کے لیے سب سے آسان اسرائیل جانا ہے اور سب سے مشکل پاکستان آنا۔ اب اگر ان ہندی مسلمانوں میں سوجھ بوجھ ہو، تو وہ اسرائیل جائیں، پاکستان نہ آئیں، لیکن یہ بے عقل لوگ آسان چیز کو چھوڑتے اور مشکل پر اصرار کرتے ہیں۔ اس بے وقوفی پر ہمارے افسر لوگوں کو بڑا طیش آتا ہے، ان کا بس چلے تو پاکستان آنے والے ہر ہندوستانی مسلمان کی گردن اتار کر اس کی نعش سرحد پر لٹکا دیں تاکہ لوگ دیکھیں، عبرت پکڑیں اور ادھر کا رخ نہ کریں، مگر کیا کریں کہ انہیں رائے عامہ سے ڈر لگتا ہے۔

ایوب صاحب کے زمانے میں یہ رائے عامہ دبی ہوئی بھٹو صاحب جیسے لوگ وزیر تھے، جو خود بھی ہندوستانی مسلمانوں سے "الرجک" تھے، اس زمانے میں وزارتِ خارجہ اور وزارتِ داخلہ نے طے کیا کہ ویزا کے ایسے قائدے، قوانین بنائے جائیں کہ ہندوستانی مسلمانوں کے لیے پاکستان آنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہو جائے، اس پالیسی پر گذشتہ سالوں میں خوب عمل ہوا۔

ایک طرف تو بھارتی مسلمانوں کی حالتِ زار اور ان کی ہمدردی میں وزیرِ خارجہ لانبے چوڑے بیانات دیتے تھے۔ دوسری طرف خود ہندوستانی مسلمانوں کو مظالم کا نشانہ بنایا جا رہا تھا۔ اس مظالم کی تفصیل دہلی میں پاکستانی ہائی کمیشن کے سامنے قطاروں میں کھڑے ہوئے لوگوں سے پوچھیئے۔

ایوب خاں صاحب کے دور سے پہلے جو ہندوستانی مسلمان مغربی پاکستان آنا چاہتے تھے۔ انہیں ویزا لینے کے لیے دہلی جانے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی، وہ اپنے علاقوں میں یہ ویزا حاصل کر سکتے تھے، لیکن پھر قانون بنا کہ مغربی پاکستان کے لیے ویزا صرف دہلی سے ملے گا اور ویزا لینے کے خواہش مند افراد کو ذاتی طور پر دہلی میں پاکستانی ہائی کمیشن کے دفتر پر پہنچنا ہوگا، اس کے معنی یہ ہیں کہ ہندوستانی مسلمان خواہ راجستھان کا رہنے والا ہو، یا جالندھر کا رہنے والا ہو، یا مدراس اور بمبئی کا، پہلے اپنے علاقے سے دہلی تک کا سفر طے کرے۔

دوسرا قانون یا اصول ہائی کمیشن والوں نے یہ مقرر کیا کہ ویزا صرف اس شخص کو ملے گا، جس کا کوئی بہت ہی قریبی رشتے دار مثلاً باپ، بیٹا، بھائی، ماں، بہن وغیرہ بہت سخت بیمار ہو اور اس بیماری کے متعلق ٹیلی گرام کی اطلاع موجود ہو۔ ویزا ملنے کی دوسری صورت یہ ہے کہ قریبی عزیز کی کوئی شادی ہو اور اس شادی میں آپ کی شرکت ضروری ہو اور شادی کے بارے میں ٹیلی گرام بطورِ ثبوت پیش کیا جا سکے۔ اب ماں اگر ہندوستان میں ہے، بیٹا پاکستان میں اور دونوں ایک دوسرے سے ملنا چاہتے ہیں، تو پہلے انتظار کریں کہ قسمت یاوری کرے اور بیٹا سخت بیمار پڑ جائے، تار سے اس کی نازک حالت کی اطلاع آئے، یہ مرحلہ آئے گا، تو ویزا حاصل کرنا ممکن ہوگا۔ دوسری طرف یہ کہ بیٹا شادی کرنے کا فیصلہ کرے اور اگر شادی شدہ ہے تو نکاح ثانی کا بندوبست کرے۔ اس طرح کے قاعدوں قوانین کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوگوں نے علالت اور شادی کے جھوٹے تار منگوانے شروع کیے، تاکہ ویزا لے سکیں، لیکن جو لوگ جھوٹ نہیں بولتے وہ کیا کریں۔؟

حیدرآباد دکن کے ایک جسٹس ابوسعید مرزا کی صاحبزادی پاکستان میں ہیں۔ ابوسعید مرزا صاحب ویزا لینے ہائی کمیشن گئے اور کہا: مجھے ویزا چاہیئے۔ دس سال سے میں نے اپنی لڑکی کو نہیں دیکھا، خیر سے بھلی چنگی ہے اور شادی شدہ بھی، سہاگ بھی اس کا سلامت ہے۔ اس لئے اب میرے پاکستان جانے کی صورت کیا ہوگی؟ جہاں تک علالت، موت، یا شادی کا جھوٹا ٹیلی گرام پیش کرنے کا معاملہ ہے، تو جناب! میں مسلمان ہوں اور جسٹس بھی، کس طرح جھوٹ بولوں؟ ہائی کمیشن والوں نے کہا: جناب پاکستان کا ویزا چاہیئے، تو جھوٹ بولنا ہوگا، پاکستان کی سرزمین پر وہی لوگ قدم رکھ سکتے ہیں جو دروغ گو ہوں، اگر آپ صدق شعار ہیں، تو ہندوستان میں رہیئے اور مولانا عبدالماجد دریاآبادی کا اخبار "صدق" پڑھیئے، لیکن سچ بولنے والا آدمی پاکستان پہنچ جائے۔ ع

ایں خیال است و محال است و جنوں۔

معلوم نہیں جناب ابوسعید مرزا پر یہ سن کر کیا گزری، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمان کو سرزمینِ اسلام، پاکستان آنے کے لیے ہر ہر قدم پر جھوٹ بولنا ہوتا ہے اور جتنا جھوٹ یہ بولتے ہیں، اس کا مواخذہ حکومتِ پاکستان کے ان ذمہ دار اصحاب سے آخرت میں ضرور ہوگا، جنہوں نے ویزا کے لیے ایسے اصول اور قوانین مقرر کیے ہیں کہ جھوٹ بولے بغیر چارہ نہیں۔

روپے خرچ کر کے پہلے دہلی پہنچئے، پھر جھوٹے تار اور خط پیش کیجئے، اس کے بعد جو ویزا ملتا ہے، وہ صرف سات دن یا زیادہ سے زیادہ دس دن کا ہوتا ہے، حالانکہ ایوب خاں صاحب کی صدارت اور بھٹو صاحب کی وزارتِ خارجہ سے پہلے تین ماہ کا ویزا عام ملا کرتا تھا، اور گھر بیٹھے ملا کرتا تھا۔ یہ سات دن اور دس دن کا جو ویزا ملتا ہے، اس کے ملنے کی داستان بھی بڑی دلخراش ہے۔ مثلاً آپ جمعہ کو دہلی پہنچے، معلوم ہوا ویزا فارم دینے کا دن جمعرات کا ہے۔ یہ جمعرات کے علاوہ کسی دن نہیں دیا جاتا۔ اب آپ دہلی کے کسی ہوٹل میں کمرہ لے کر مقیم رہیں اور جمعرات کا انتظار کریں کہ جمعرات آئے اور فارم ملے۔ فارم دینے کی طرح فارم لینے اور دوسری مختلف کاغذی کارروائیوں کے الگ الگ دن مقرر ہیں۔ اس طرح ویزا لینے کے لیے آٹھ دس دن تک دہلی میں پڑے رہنا عام بات ہے۔ پہلے تو دہلی پہنچنے میں کافی وقت صرف ہو جاتا ہے اور پھر یہ بے وجہ کے قیام و طعام کے اخراجات الگ ہوتے ہیں۔ روزانہ ہائی کمیشن کے سامنے فارم لینے، فارم دینے وغیرہ کے لیے دھوپ میں قطاروں میں کھڑے رہنے کی مصیبت الگ ہے۔ ان مصیبتوں سے نجات کی دوسری صورت یہ ہے کہ ہائی کمیشن کے کلرکوں یا دلالوں کو رشوت دیجیئے اور جھٹ پٹ معاملہ طے کر لیجئے، لیکن یہ رشوت کچھ کم نہیں، غریب آدمی نہ دہلی آ سکتا ہے، نہ یہاں ٹھہر سکتا ہے اور نہ رشوت دے سکتا ہے۔ اس صورتِ حال پر ہمارے افسر لوگ خوش ہیں کہ اس طریقے پر ہم نے پاکستان آنے والوں کی خاصی حوصلہ شکنی کر رکھی ہے اور ان کے لیے کافی رکاوٹیں پیدا کر دی ہیں، اگر ان رکاوٹوں کو عبور کر کے کوئی مسلمان پاکستان آتا ہے، تو بھی اس بے چارے کو سکون کا سانس لینا نصیب نہیں ہو سکتا۔ وہ پہلے پولیس ہیڈ کوارٹر جائے، فارموں کی خانہ پری کرے، پھر پولیس تھانے میں مجرموں کی طرح پیش ہو اور اس کے ساتھ ہی کراچی میں چیف کمیشن کے دفتر پہنچ کر ویزا کی میعاد بڑھانے کے لیے کاغذی کارروائیوں

کے چکر میں مبتلا ہو جائیے جو لوگ سات یا دس دن کا ویزا لے کر آتے ہیں وہ کافی رقم خرچ کر کے یہاں پہنچتے ہیں، اگر وہ چاہیں کہ ایک دو ماہ رہ کر پاکستان، دیکھیں، عزیز و اقارب سے ملاقات کریں تو اس کے لیے ویزا کی میعاد میں توسیع نہیں کی جا سکتی۔ میعاد بڑھانے کے لیے، ایسا بیمار ہونا کہ آپ سفر کے قابل نہ رہیں، ضروری ہے۔ ویزا میں توسیع کی درخواست کے ساتھ میڈیکل سرٹیفکیٹ منسلک کرنا ہوتا ہے — اب ظاہر ہے ہر پاکستان آنے والا بیمار نہیں ہوتا، لیکن میعاد بڑھانے کے لیے جھوٹا میڈیکل سرٹیفکیٹ ضرور پیش کرنا ہے، جو پانچ روپے فی سرٹیفکیٹ کے حساب سے آپ کو مل جاتے ہیں۔ اس جھوٹے سرٹیفکیٹ اور طرح طرح کے فارموں کی خانہ پُری کر کے آپ پھر قطار میں کھڑے ہو جائیے اور ویزا میں چوبیس دن کی مدّت بڑھا لیجیے۔ اس سے زیادہ توسیع نہیں ہو گی، یہ میعاد ختم ہونے پر آپ کو پھر دوسرا جھوٹا سرٹیفکیٹ پیش کرنا اور دوسری بار قطاروں میں کھڑے ہونا ہو گا۔ یہ ہے وہ رویہ جو ہم نے ہندوستانی مسلمانوں کے بارے میں اپنایا ہے۔ اس کے ساتھ ہم ان کی حالتِ زار پر مگرمچھ کے آنسو بھی بہاتے ہیں۔ ان کی مظلومیت پر اخبارون میں غصّے اور افسوس کا اظہار کرتے ہیں، لیکن پاکستانی ہائی کمیشن سے نہیں کہتے کہ یہاں ان ہندوستانی مسلمانوں کو جنھوں نے پاکستان بنایا ہے، جانور نہ سمجھو، یہ انسان ہیں اور انسانی سلوک کے مستحق۔

کیا ہندوستانی مسلمانوں کا پاکستان پر اتنا بھی حق نہیں کہ وہ جب چاہیں یہاں کچھ دنوں کے لیے آسانی سے آ سکیں؟ آخر اس میں کیا ہرج ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کو سات دن یا دس دن کے بجائے تین ماہ کا ویزا دیا جائے اور رد و بدل طلب کئے بغیر اس طرح دیا جائے کہ جھوٹ بولنے اور جھوٹے تار خط پیش کرنے کی ضرورت نہ رہے۔

ایوب خاں کے زمانے میں افسروں کی خداوندی تھی رائے عامہ دبی ہوئی تھی، اس لیے ہندوستانی مسلمانوں کے بارے میں حکومتِ پاکستان کے رویے کا مسئلہ بھی دبا رہا، لیکن اب یہ ابھر کر سامنے آیا ہے۔ احمد آباد وغیرہ کے حالیہ فرقہ وارانہ فسادات کا بھی سخت ردِ عمل ہے۔ مجھے سارے پاکستان کا حال معلوم نہیں لیکن کراچی میں شاید ہی کوئی گھر ایسا ہو جہاں پچھلے دنوں ہندوستانی مسلمانوں کی مظلومیت کی داستان موضوعِ گفتگو نہ رہی ہو۔ لوگ اب صاف صاف کہتے ہیں کہ ہندوستانی مسلمانوں کے لیے پاکستان کی سرحد کھل جانی چاہیے۔ اسرائیل چھوٹا سا علاقہ ہے اور ساری دنیا کے یہودیوں کو اپنے پاس آنے کی دعوت دیتا ہے۔ کیا پاکستان میں ہندوستانی مسلمانوں کے لیے جو یہاں آنا چاہتے ہیں کچھ گنجائش نہیں؟ پچھلے ہفتے لیاقت آباد میں ایک جلسہ ہوا جس سے علامہ ابن حسن جارچوی اور جناب اے بی حلیم نے خطاب کیا۔ اس جلسے نے متفقہ طور پر یہ قرارداد منظور کی کہ ہندوستان کے مسلمان خاندانوں کے لیے پاکستان کی سرحدیں کھول دی جائیں۔ شاید اس طرح کے مزید جلسے بھی کراچی میں ہوں گے اور ان میں مطالبہ کیا جائے گا کہ پاکستان کے اصل خالق جو پاکستان میں پناہ حاصل کرنے کے لیے ترس رہے ہیں، ان کے مسئلے پر ہمدردی سے غور ہو۔

ہندوستانی مسلمانوں کے لیے سرحدیں کھول دینے کا مطالبہ ایسا ہے کہ اس پر احتیاط سے غور ہونا چاہیے، لیکن جہاں تک ویزا قوانین کو نرم اور آسان بنانے کا تعلق ہے اس پر کسی لمبے چوڑے غور کی ضرورت نہیں اور اس سلسلے میں فوری اقدامات ہونے چاہئیں۔ حکومت نے بھی عوام کے ردِ عمل کو اس سلسلے میں محسوس کر لیا ہے اور اب حکم جاری کیا ہے کہ سات یا دس دن کے بجائے ایک ماہ تک کا ویزا دیا جا سکتا ہے، لیکن یہ کافی نہیں ہے۔ ویزا کے قوانین وہی ہونے چاہئیں جو دورِ ایوبی سے پہلے تھے ورنہ اس دور کے ختم ہونے کا ہندوستانی مسلمانوں کو کیا فائدہ؟

ہندوستانی مسلمانوں سے جو پاکستان آئیں یا آنا چاہیں، حسنِ سلوک کا مسئلہ ایک طرح سے خود پاکستانی شہریوں کے حقوقِ شہریت کا بھی مسئلہ ہے۔ جو لوگ ہندوستان سے آتے ہیں وہ پاکستانی شہریوں کے قریبی عزیز ہوتے ہیں اور انھیں اس کا پورا حق ہے کہ وہ ان سے ملاقات کریں اور اپنی ماں بہن، بھائی یا باپ کو اپنے گھر مہمان رکھیں۔ اس لیے جب آپ یہ چاہتے ہیں کہ ان کی آمد کو ناممکن یا مشکل بنا دیا جائے، تو اس سے خود مہاجر پاکستانی شہریوں کے حقوق کی بھی خلاف ورزی ہوتی ہے جن کی تعداد اس پاکستان میں دو کروڑ سے زائد ہے۔

ہندوستانی مسلمانوں کو پاکستان آنے کے لیے ویزا دینے کے معاملے میں جو تنگ دلانہ پالیسی اپنائی گئی ہے، وہی تنگ دلانہ بلکہ متعصبانہ پالیسی پاکستانی مسلمانوں کو ہندوستان کا پاسپورٹ دینے کے سلسلے میں اختیار کر لی گئی ہے۔ ایوب خاں کے برسرِ اقتدار آنے سے پہلے پاسپورٹ پانچ سال کے لیے ہوا کرتا تھا، لیکن ایوبی دَور میں یہ ایک سال کے لیے کر دیا گیا۔ آخر میں یہ فیصلہ ہوا کہ بھارت کے لیے جو پاسپورٹ جاری ہو گا وہ صرف دو ماہ کے لیے کارآمد ہو گا۔ اس دو ماہی پاسپورٹ سکیم کا جو ایوب خاں کے زمانے میں بن چکی تھی حال ہی میں اعلان ہوا ہے اور غالباً یہ بات مارشل لاء حکومت کے ذمہ دار اصحاب کی نظروں سے اوجھل رہی ہے ورنہ وہ ضرور اس پر عملدرآمد روک دینے کا حکم دیتے۔ پھر یہ دو ماہی پاسپورٹ جو پاکستانی شہریوں کا حق ہے، آسانی سے نہیں ملتا۔ اس کے لیے بھی بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ متعلقہ حکام نے اجرائے پاسپورٹ کے لیے یہ شرط رکھی ہے کہ ہندوستان سے جب موت، شادی یا علالت کی اطلاع بذریعہ ٹیلی گرام آئے گی تو پاسپورٹ جاری ہو سکے گا۔ اس وجہ سے لوگ مجبور ہیں کہ ہندوستان سے موت، علالت یا شادی کے جھوٹے تار منگوائیں اور پاسپورٹ حاصل کریں۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ پاسپورٹ کا محکمہ اس بات کو تسلیم کر لے کہ پاکستان کے دو کروڑ مہاجر اپنے والدین یا عزیز و اقارب سے ملاقات کے لیے ہندوستان جانے کا پورا پورا حق رکھتے ہیں اور اپنا یہ حق وہ کسی دشواری کے بغیر استعمال کر سکتے ہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ جشنِ استقلال افغانستان کی تقاریب میں شرکت کے لیے پاسپورٹ دیا جا سکتا ہے۔ روس اور چین کے لیے پاسپورٹ مل سکتا ہے، لیکن اگر نہیں مل سکتا تو ہندوستانی مسلمانوں کے پاس جانے کے لیے نہیں مل سکتا۔ آخر پاکستانی مسلمان اور ہندوستانی مسلمان کا ایک دوسرے کے پاس آنا جانا اور ایک دوسرے سے ملنا جلنا، کیوں مزاجِ سرکارِ عالی پر گراں گزرتا ہے؟ آخر ہم کیوں ہندوستانی مسلمانوں کو اچھوت سمجھ کر نہ انھیں اپنے پاس آنے دیتے ہیں اور نہ خود ان کے پاس جاتے ہیں؟ کچھ تو معلوم ہو کہ بیچارے ہندوستانی مسلمانوں سے وہ کیا قصور سرزد ہو گیا ہے جس کی اتنی سخت سزا انھیں دی جا رہی ہے؟ وہ کب تک ہمارے اس ظلم کا نشانہ بنے رہیں گے؟

صدر ایوب سے پہلے بھارت کے پاسپورٹ کے لیے صرف تین روپے فیس دینی ہوتی تھی، یہ بھی پچیس روپے کر دی گئی۔ پہلے میاں بیوی کا ایک ہی پاسپورٹ ہو سکتا تھا، بعد میں الگ الگ پاسپورٹ ضروری قرار دیے گئے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک میاں بیوی پاسپورٹ حاصل کرنے کے لیے پچاس روپے فیس ادا کریں اور تین روپے کی جگہ پچاس روپے فیس دے کر بھی پاسپورٹ حاصل کرنا ایک طویل کارروائی کے بغیر ممکن نہیں؛ حالانکہ ویسے بھی پاسپورٹ شہریوں کا بنیادی حق ہے اور ہندوستان کے تعلق سے ہمارا یہ حق خاص طور پر اہم ہے۔ ہندوستان کے ساڑھے چار کروڑ مسلمانوں سے ہمارے جو رشتے ہیں وہ منقطع نہیں ہو سکتے اور انھیں منقطع ہونا بھی نہیں چاہیے۔ یہ بات کہ وہ ساڑھے چار کروڑ مسلمان ہمیں بھول جائیں اور ہم انھیں بھول جائیں ممکن نہیں۔ یہ نقطۂ نظر مہاسبھا اور جن سنگھ کا ہے، آخر ہم اسے کیوں اپنائیں۔ ——

کوئٹہ

ون یونٹ کی دیگ میں تتّو لوہار

مسلم قریشی

۵ اکتوبر کو بلوچ لیڈروں کے "بلوچستان متحدہ محاذ" کا کنونشن ہوا۔ اس میں پٹھان لیڈر اس لیے شریک نہیں ہوئے کہ وہ متحدہ بلوچستان یا سابق بلوچستان کی بحالی کے مخالف ہیں اور چاہتے ہیں کہ بلوچستان کے پٹھان علاقے کو پشاور کے ساتھ ملا دیا جائے۔ چنانچہ اب پٹھان لیڈروں کا علیحدہ کنونشن منعقد ہوا، جس میں ان پٹھان رہنماؤں نے شرکت کی جو سابق صوبہ سرحد سے الحاق کے حامی ہیں۔

اس کنونشن کے داعی اور صدر نواب محمد خاں جوگے زئی تھے جو قیام پاکستان کے وقت مسلم لیگ کے سرگرم کارکن اور رہنما تھے۔ اس وقت وہ اپنے سیاسی حریف جناب عبدالصمد خاں اچکزئی کے ساتھ متحد و متفق ہیں۔ جناب قاضی عیسیٰ بھی اس اجلاس میں شامل تھے۔ افتتاحی تقریر نواب محمد خاں جوگے زئی نے کی۔ انہوں نے کہا:

"یونٹ ٹوٹ رہا ہے۔ مختلف آوازیں اٹھ رہی ہیں۔ کوئی اسے اُدھر کھینچ رہا ہے، کوئی اِدھر۔ پٹھانوں کو بھی اپنے مستقبل کی فکر ہونی چاہیے۔ میں نے آپ سب کو اس لیے بلایا ہے کہ کوئی متفقہ فارمولہ طے کر لیں اور اس پر عمل پیرا ہوں۔ جناب عبدالصمد خاں اچکزئی نے خوشی کا اظہار کیا کہ آج سب سردار، سرکاری و غیر سرکاری، اس مجلس میں شامل ہیں۔ انہوں نے کہا: "کوئی قوم بغیر تعلیم کے ترقی نہیں کر سکتی اور تعلیم ہماری مادری زبان کے بغیر نہیں دی جا سکتی۔ میری خواہش ہے کہ پٹھان علم حاصل کریں اس لیے ضروری ہے کہ اپنی مادری زبان پشتو میں انہیں پڑھایا جائے۔ انہوں نے پٹھانوں کی زبان اور ثقافت کے تحفظ کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ پٹھانوں کو متحد رہنا چاہیئے، اور انہیں اپنے ہم زبان سرحدی بھائیوں سے مل جانا چاہیئے۔ انہوں نے کہا سرحد کے پٹھانوں سے ہمیں کوئی خطرہ نہیں۔ وہ ہماری اپنی قوم ہیں لیکن بلوچوں سے مل کر رہنے میں خدشہ ہے کہ اقلیت ہونے کے باعث ہم اپنی انفرادیت کھو بیٹھیں اور ایک وقت ایسا آئے کہ ہم بلوچوں میں بالکل مدغم ہو جائیں۔ انہوں نے رئیسانی اور چند دوسرے قبیلوں کی مثال دی کہ یہ پہلے پٹھان تھے، لیکن اب بلوچوں میں رہنے کے باعث بدل گئے ہیں اور بلوچ بن گئے ہیں۔ انہوں نے کہا اکثریت اقلیت کو کھا جاتی ہے، یہی خطرہ ہمیں پنجاب سے رہا ہے اور یہی خطرہ ہمیں بلوچوں سے ہے۔"

یاد رہے اب سے کچھ عرصہ پہلے پٹھان اور بلوچ متحد تھے لیکن یونٹ ٹوٹتا نظر آیا، تو دونوں کے راستے الگ ہو گئے اور عین ممکن بلکہ یقینی ہے کہ آگے چل کر خود پٹھانوں کے مختلف قبائل کے درمیان ایسی ہی مخالفتیں ابھرنے لگیں۔

جناب صمد خاں اچکزئی کے بعد جناب محمد عثمان جوگیزئی نے کہا: "پچھلے بیس سال میں نہ تو عبدالصمد خاں نے پشتونستان بنایا، نہ قاضی عیسیٰ اصلاحات کرا سکے اور نہ نواب صاحب (جوگیزئی) کا جرگہ۔ آج شکر ہے سب مجبور ہو کر اکٹھے ہوئے اور سوچ رہے ہیں کہ کیا کریں۔

سردار صاحب نے ون یونٹ کو ایسی دیگ سے مشابہت دی جس میں کئی لوہار بیٹھے ٹھک ٹھک کر رہے ہیں لیکن ایک دوسرے کی آواز نہیں سنتے۔ انہوں نے کہا جنہوں نے ون یونٹ بنایا تھا اب وہی اسے توڑنے پر تیار ہیں۔ ہمیں چاہیئے کہ پشاور سے چند آدمیوں کو بلائیں اور ان سے پوچھیں کہ ہمیں ساتھ ملاتے ہو؟ اگر ملاتے ہو تو ہمیں کیا دو گے؟ عثمان صاحب نے بالغ رائے دہی کا مطالبہ کرتے ہوئے کہا کہ سردار کی حیثیت اب بے معنی ہے۔ سردار پہلے تنخواہ دار ڈرائیور تھا اب کلینر ہے۔"

اس کے بعد چند اور مقررین نے تقریریں کیں جو تند و تلخ بھی تھیں اور جائز شکایات اور گلے شکووں سے بھرپور بھی۔ ون یونٹ سے جو مسائل اور مشکلات پیدا ہوئیں ان کا ذکر ہوتا رہا اور مقررین دل کا بخار نکالتے رہے۔ ایک مقرر نے کہا: "پنجاب کی آبادی بڑھ گئی ہے، زمین کم ہے۔ اس لیے وہاں کے لوگ ہمارے ہاں آ کر آباد ہو رہے ہیں۔ وہ ہمارے بھائی ہیں، لیکن ہمیں اس پہ اعتراض ہے کہ وہ ہمارے حقوق بھی ہم سے چھیننے لگے ہیں۔ افسر شاہی اپنے آدمیوں کو روزگار دلانے کے لیے بلا ضرورت نئے نئے محکمے قائم کرتی رہی ہے۔ کوئٹہ جہاں پانی کی سخت قلت ہے، وہاں سیم اور تھور کے محکمے کی کیا ضرورت تھی؟"

قاضی عیسیٰ صاحب نے کہا "میں سیاست سے دستبرداری کا اعلان کر چکا تھا لیکن میرے بزرگوں نے مجھے آج یہاں آنے کے لیے کہا، سو میں آ گیا۔ جہاں تک پاکستان کی خدمت کا تعلق ہے مجھ سے زیادہ خدمت کس نے کی؟ ون یونٹ تو ٹوٹ رہا ہے لیکن ہمیں محتاط ہونا چاہیے جس طرح دیوار گرنے والی ہو تو سب لوگ سنبھل جاتے ہیں کہ کوئی نیچے نہ آ جائے۔"

قاضی صاحب نے پچھلے سال انٹر کالج ہوسٹل میں شہید ہونے والے طالب علم کی موت کی عدالتی تحقیقات کا مطالبہ کیا اور کہا "کیا ہم پاکستان کے شہری نہیں؟ ہمارا یہ مطالبہ حق بجانب نہیں؟ خواجہ ناظم الدین کے عہد میں ایک مشرقی پاکستانی طالب علم ہلاک ہو گیا تھا، تو ایسا طوفان اٹھا تھا جسے اب بھی آپ سب دیکھ رہے ہیں، لیکن ہمارے جگر گوشے کی موت کی تحقیقات تک نہیں ہوئی حالانکہ سڑک پر سے گزرتے ہوئے کسی جانور کو مار دیا جائے تو بھی عدالتی کارروائی ضروری ہوتی ہے۔ ہمارے مسائل سے کوئی دلچسپی نہیں لی جاتی۔ جو بھی آتا ہے یہی کہتا ہے کہ آپ کا علاقہ بڑا پس ماندہ ہے۔ اس کا کیا کیا جائے؟ لیکن عملی کام کوئی نہیں کرتا اور بہانہ یہ بنایا جاتا ہے کہ اس علاقے کو ترقی دینا مشکل ہے۔ انہوں نے کہا کہ اگر آپ (غیر بلوچستانی مراد ہے) اس علاقے کے مسائل نہیں سمجھ سکتے تو مہربانی کر کے یہ علاقہ ہمارے حوالے کر دیجئے، ہم تو سمجھتے ہیں ہم خود اسے ٹھیک کر لیں گے۔ یہ بات کہتے ہوئے غالباً ان کے سامنے اپنا بیس سالہ کردار نہ تھا۔ اقتدار کے زیر سایہ رہ کر عوام کو ان کے حقوق سے محروم

ناہید، نائیلہ۔ نمو۔ انیلا۔ نورین۔ صاعقہ۔ شبو۔ وحشی۔ عاشی کے بعد

ملک کی نامور مصنفہ 'رضیہ بٹ' کا نیا شاہکار

"شیخو"

بہت جلد آپ کی خدمت میں پیش کر دیا جائے گا۔

قیمت چھ روپے

شیخو رضیہ بٹ کے منتخب ڈراموں کا مجموعہ ★ ایک ایسی لاجواب کتاب جو ایک مدت تک آپ فراموش نہ کر سکیں گے!

احسن برادرز ۲۔ المینار مارکیٹ چوک انار کلی لاہور فون نمبر: ۵۴۱۰۸

Z. A. Syed

رکھنے والے آخر کون تھے؟

انہوں نے کہا یہ تحریک (غالباً پختونستان کی تحریک) ہم نے نہیں شروع کی، یہ تو خود انہوں نے (یعنی غیر پٹھانوں نے) شروع کی ہے، ہمیشہ انہوں نے ہی پیش قدمی کی ہے۔

جناب عبدالصادق کانسی (نیپ) نے کہا کہ یہاں کے عوام کے مطالبے پر یونٹ ٹوٹ رہا ہے، لیکن یونٹ جیسے اہلِ پنجاب نے اپنے مفاد کے لیے بنایا تھا ایسے ہی وہ اسے توڑنے کی بھی وہ شکل پسند کرتے ہیں جو ان کے مفاد میں ہو۔ نوکر شاہی کی مرضی کے مطابق کچھ لوگ سابق صوبے بحال کرانا چاہتے ہیں، کچھ ڈویژنل بنیادوں پر میونسپلٹی جیسا نظام قائم کرنے کے حق میں ہیں اور اختیارات مرکز کے ہاتھ میں دینا چاہتے ہیں۔ کچھ ترکی اور افغانستان کے طرز پر نظام قائم کرنا چاہتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ یونٹ آپ کے مفاد میں نہیں بلکہ ہمارے مفاد میں ٹوٹنا چاہیے۔ عوام کو کبھی فروخت نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارے عوام کی قسمت کے فیصلے ہمیشہ سرداروں نے کئے ہیں۔" لیکن آج حالات مختلف ہیں، جو فیصلہ ہوگا نوجوان کریں گے، کیونکہ ہر فیصلہ ان کے مستقبل سے تعلق رکھتا ہے۔ ہم اپنے پٹھان بھائیوں سے الحاق چاہتے ہیں جن سے ہم کو فرنگیوں نے جدا کیا تھا۔ فرنگی کے تین دشمن تھے: جرمن، ترک اور پٹھان۔ انگریز نے ان تینوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ اب ہم اپنے دشمن کے خلاف متحد ہو کر لڑیں گے۔

طالب علم لیڈر بسم اللہ خان نے پُرجوش تقریر کی اور پشتونستان کے مخالفین کی خوب خبر لی اور ایک پٹھان رہنما گل محمد خاں کو جو سابق بلوچستان کی بحالی کے حامی ہیں اور بلوچوں اور پٹھانوں کو ایک صوبے میں رہنے کی تلقین کرتے ہیں، خوب سخت سُست کہا۔ اپنی تقریر کے دوران انہوں نے ایک شعر پڑھا جس کا مطلب تھا:

"میں نہ غلجی ہوں، نہ سیّد، نہ دُرّانی۔ میں تو صرف پٹھان ہوں، صاحبِ تخت و تاج۔"

اس موقع پر نواب محمد خان جوگے زئی جوش میں آ کر اُٹھے اور اپنی لاٹھی (بڑھاپے کا سہارا) اس نوجوان کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا: "یہ لاٹھی لے لو۔ جو پٹھان بھی پشتونستان کی راہ میں حائل ہو، اس کے سر پر یہی لاٹھی مارنا۔" اس جوش و خروش کے عالم میں کنونشن ختم ہوا۔ کنونشن ختم ہونے سے پہلے کچھ قراردادیں پاس ہوئیں۔

اس کنونشن میں زبان کی بنیاد پر صوبے کا مطالبہ تو کر دیا گیا، لیکن پٹھانوں کے کئی قبیلے ہیں۔ ہر قبیلے کی زبان، رسم و رواج اور ثقافت ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ پشاور کا پٹھان اور کوئٹہ کا پٹھان لازماً مزاج، زبان اور طرزِ زندگی کے لحاظ سے مختلف ہے۔ — —

تماشائی

اُڑیں گے پُرزے

آپ بیتی ابنِ سینا جدید کی

صاحبو! بہت اِدھر اُدھر دیکھ چکے۔ اب میری طرف دیکھو، مجھ سے ملو، میں ایک بڑا ادیب، بڑا شاعر اور بہت بڑا کالم نگار ہوں۔ میرا اصل نام گل شیر محمد تھا، جس سے مجھے سخت ترین نفرت تھی۔ میرے باپ نے، جو سامراج کی مخالفت نہ کرنے کی بنا پر سامراجی بنا اور میری ماں نے، جو صوم و صلوٰۃ کی پابند ہونے کی بنا پر رجعت پسند کہلائی ——— میرا یہ نام رکھا تھا، لیکن میرا مزاج لڑکپن ہی سے ترقی پسندانہ تھا؛ سو میں نے اپنا نام بدل کر "ابنِ سینا جدید" رکھ لیا۔ اس نام سے مجھے دو فائدے ہوئے۔ میرا اور میرے باپ دونوں کا نام بدل گیا۔ اب میں آپ کے سامنے مُنہ دکھانے کے قابل ہوں۔ چار آدمیوں میں بیٹھ کر پرچار یعنی کام کی بات کر سکتا ہوں۔

آج میں یعنی ابنِ سینا جدید آپ کو اپنی داستانِ زندگی سنانے آیا ہوں۔ اس وقت آپ کوئی بہت ہی معقول کام کر رہے ہوں گے ——— میں اس میں رخنہ ڈالوں گا۔ جس طرح خارش زدہ اپنی خارش سے بے نیاز نہیں ہو سکتا، اسی طرح مجھے دنیا بھر کے پھڈوں میں ٹانگ اڑائے بغیر چین نہیں آتا؛ لہٰذا بہتر یہ ہے کہ اس وقت آپ جو کچھ بھی کر رہے ہیں، فوراً چھوڑ دیں۔ میں مداخلت کے لیے چھت سے ٹپک رہا ہوں۔ اب آپ ایک کونے میں بیٹھ کر غور سے میری باتیں سُنیں۔ (ضروری ہدایت نمبر ا ——— سر آخر میں دُھنا جائے گا، درمیان میں مداخلت ممنوع ہے)

اس وقت جو میں آپ کو بالکل مفت اپنی داستانِ زیست یا داستانِ آوارہ گردی سُنا رہا ہوں، اس کا کوئی سبب نہیں ہے۔ بس میرا جی چاہا کہ اس بار آپ کو اس طرح یخنی دوں، لہٰذا یہ یخنی دے رہا ہوں۔ بلاشبہ یہ میری مطلق العنانی ہے، "وہی آمریت ہے" جس کے خلاف لکھنا اور شور مچانا میرا فیشن ہے، لیکن آپ کو یہ ہرگز حق نہیں کہ آپ اس پر میری گرفت کریں یا مجھے برا بھلا کہنے کی کوشش کریں۔ میں کوئی معمولی، چھوٹا موٹا، ردوا خدوا ادیب، شاعر اور کالم نگار نہیں ——— بلکہ بڑا ادیب، بہت بڑا شاعر اور بہت ہی بڑا کالم نگار ہوں۔ مجھے سب کی گرفت کا حق ہے، لیکن خبردار جو کسی نے میری گرفت کے بارے میں سوچا بھی، میں نے بڑے اخبار میں کالم لکھنے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔ اگر کسی نے میرے خلاف چوں بھی کی تو چٹکی میں مسل کر گٹر میں پھینک دوں گا۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ اس وقت آپ کو میری کہانی سننی ہے اور چُپ چاپ بیٹھ کر سننی ہے۔ اس دوران آپ کو اپنی ناک پر مکھی بیٹھی ہوئی محسوس ہوگی، لیکن خبردار جو ہاتھ بھی ہلایا۔ بالکل خاموش اور بالکل بے حس و حرکت بیٹھنا ہے اور مضمون کے اختتام پر کہنا ہے ——— واہ وا، مرحبا، سبحان اللہ، ابنِ سینا جدید تم تو ابنِ سینا قدیم سے بھی بڑے نکلے (ضروری ہدایت نمبر ۲ ——— یہ الفاظ مُنہ زبانی یاد کر لیجیے ——— بار بار نہیں بتائے جائیں گے)

لیجیے، کہانی شروع ہوتی ہے:

میں، یعنی چودھری گل شیر محمد خان ایک گاؤں ٹنڈو سر پھٹول میں یکم اپریل ۱۹۲۹ء کو بوقت زیرو آور یعنی بارہ بجے شب پیدا ہوا۔ میں نے سُنا ہے کچھ مذہبی کتابوں میں رات کے وقت کو اچھا نہیں بتایا جاتا اور کہا جاتا ہے رات کو آسمان سے بلائیات زمین پر اترتی ہیں۔ آپ مجھے شوق سے رات کو نازل ہونے والی بلا کہیں۔ مجھے آپ کی نہیں رات کی پروا ہے، جو مجھے بڑی خوب صورت لگتی ہے۔ راتوں کو جب ساغر و جام کی محفل جمتی ہے، رقاصائیں اپنے گھنگھرو کھنکاتی ہیں اور بغداد کی راتوں میں سے میری پسندیدہ رات کا سماں بندھ جاتا ہے تو جی چاہتا ہے کہ اب کبھی دن نہ نکلے۔ دوسری بات یہ ہے کہ آپ کا تبصرہ زیادہ سے زیادہ ایک تلخ حقیقت ہوگا، تو مجھے اس کی پروا نہیں۔ قصہ یہ ہے کہ ارغوانی رنگ کا ایک مشروب، جسے شر پسند، تشدد پسند اور رجعت پسند حرام اور امّ الخبائث کہتے ہیں، مجھے بہت

اچھا لگتا ہے۔ اس کی تلخی مجھے ایسی بھاتی ہے اور اب میں اس کا اس قدر عادی ہو چکا ہوں کہ مجھ پر حقیقتوں کی تلخی کا ذرہ برابر اثر نہیں ہوتا۔ اب میں ان چھوٹی اور پوچ باتوں سے بہت اونچا اُٹھ چکا ہوں۔

ٹنڈو سرمیٹول میں میرا بچپن اور لڑکپن اپنے نام پر شرمانے اور ماں باپ کی مذہبی، رجعت پسندانہ اور سامراجی حرکتوں پر کڑھنے میں گذرا۔ پندرہ سال کی عمر ہوئی تو مجھے کالج میں پڑھنے کے لیے شہر بھیجا گیا۔ یہاں میری ملاقات ان لوگوں سے ہوئی جنہیں آپ کو کم از کم علم کا سمندر ماننا پڑے گا۔ یہ لوگ تھے سامراج دشمن۔ ان کے علم کی وسعت کا یہ عالم تھا کہ امریکہ، برطانیہ، روس اور چین ——— پورے چار ملکوں کے بارے میں سب کچھ جانتے تھے۔ انہیں امریکہ اور برطانیہ کی تمام بے ایمانیوں اور دھاندلیوں کا علم تھا اور وہ انہیں کئی انداز کی گالیاں دینے پر قادر تھے۔ ان گالیوں کو کبھی وہ گا کر سناتے اور کبھی تحت اللفظ پڑھتے۔ ان لوگوں سے مجھے معلوم ہوا کہ روس اور چین بڑے زوردار ممالک ہیں اور ابھی تک میرا ایمان یہی ہے۔ اب اُکے کچھ عیب ہیں رجعت پسند، روس اور چین میں بھی برائیاں نکالنے لگے ہیں، لیکن یہ لوگ وہ ہیں جنہیں دنیا کی ہر چیز میں کیڑے ڈالنے کی عادت ہے۔

ضروری ہدایت نمبر ۳ ——— میں وارننگ دیتا ہوں کہ ان رجعت پسندوں کی آپ ہرگز نہ سُنیں۔ سب سے بڑا کالم نگار اور ایماندار ادیب میں ہوں۔ میرے کالم کو پڑھنا اور آنکھوں سے لگانا کافی ہے۔

اُن دنوں میں نیا شاعر تھا، لیکن سامراج دشمنوں کی منڈلی میں شرکت کا فائدہ یہ ہوا کہ میں دیکھا دیکھی بڑا شاعر بننے لگا۔ خدا جانے میں آکاس بیل تھا یا گڈی یا میری شاعری میں کسی لڑکی کی روح حلول کر گئی تھی ——— میں صبح کچھ اور شام کچھ کے حساب سے بڑا شاعر بن گیا۔ ان ہی دنوں ایک عجیب واقعہ ہوا۔ ایک دن میں نے کسی اخبار میں بیت المقدس اور فلسطین کا حال پڑھا اور منڈلی میں تذکرہ کر دیا۔ ان سب کو اک دم کرنٹ لگ گیا۔ پہلے تو وہ ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے، پھر لپک کر میری طرف آئے۔ مجھے مجرموں کی طرح پکڑ لیا: کیسے فلسطین اور بیت المقدس کہاں ہیں یہ علاقے، تم نے کیسے پڑھا؟ اس طرح کے نہ جانے کتنے سوال انہوں نے کر ڈالے۔ پھر مجھے مشکوک آدمی سمجھ کر ہاسٹل کے کمرے میں بند کر دیا۔ اپنی میٹنگ کی اور کسی نامعلوم گروہ سے 'لائن' یعنی مشورہ طلب کیا۔ کئی دن بعد جب میں نے مکمل وفاداری کا یقین دلایا، زندگی بھر کے لیے صرف سفید سامراج کا دشمن بنا رہنے کا عہد کیا، فلسطین اور بیت المقدس کے معاملات اور ان کی بنیادوں پر ہرگز کچھ نہ پڑھنے کا عہد کیا ——— تب کہیں جا کر رہائی ہوئی۔ وہ دن ہے اور آج کا دن، میں صرف سفید سامراج کا کٹر دشمن ہوں اور اپنے ہر مخالف کو منٹوں میں سامراجی ایجنٹ ثابت کر سکتا ہوں۔ میں نے ہر چیز کا مذاق اڑانا سیکھا ہے؛ لہٰذا میں مذہب کا بھی بہت اچھا۔ آپ کو بے حد پسند آنے والا بلکہ لوٹ پوٹ کر دینے والا ——— مذاق اڑا سکتا ہوں۔ مجھے یہ تک معلوم نہیں کہ تفسیر میں اصل قرآن بھی نقل کیا جاتا ہے۔ لہٰذا میں اپنے قلم کی قلابازی سے تفسیر کو اس کے ادیب کی ایک معمولی تصنیف ثابت کر سکتا ہوں۔ میں نے، یعنی ابن سینا جدید نے ثابت کیا ہے کہ بغیر کچھ پڑھے لکھے، بغیر کچھ دیکھے بھالے، معمولی محنت اور غفلتوں کے سہارے سفید سامراج کا دشمن اور مشہور کالم نگار بننے کا راز کیا ہے؟ میں اسے چھپاتا نہیں صاف صاف اور سب کو بتا سکتا ہوں۔ راز یہ ہے کہ لکھو خواہ کیسا بھی، چھپواؤ بڑے اخبار میں ——— اخبار کی اشاعت کا مینار آپ سے آپ تمہیں اونچا اٹھا دے گا۔ (ضروری ہدایت نمبر ۴۔ راز بتا دیا گیا ہے، لیکن خبردار جو قسمت آزمائی میں نے اور میرے ساتھیوں نے انتظام کر رکھا ہے۔ اچھا لکھنے والے میدان میں قدم نہ رکھنے پائیں۔ اگر کسی نے قدم رکھ بھی دیا، تو ہم لوگ بڑی 'ہمت شکنی' کریں گے۔)

* *

تعلیم کی تکمیل کے بعد میری ملاقات مرزا تلیچ بیگ سے ہوئی۔ پہلے پہل میری ان سے دوستی ہوئی۔ پھر بات بڑھی اور رقابت ہو گئی۔ اب رقیبانہ دوستی یا دوستانہ رقابت کا دور ہے۔ بیگ صاحب نے دنیا کی سیاحت کر کے سفر نامہ لکھنا شروع کیا تھا، اس وقت میری ان سے دوستی تھی۔ ان کی مقبولیت بڑھی تو رقابت ہو گئی۔ میں سیدھا ٹنڈو ابرانی خاں گیا اور ابن بطوطہ بننے کا اجازت نامہ جھپٹ لایا۔ میں نے بھی سفر نامہ لکھنا، چھپوانا اور پڑھوانا شروع کیا۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں، میں نے ہمیشہ کی طرح سفر نامہ بھی بہت اچھا لکھا، لیکن یہ اخبار چھوٹا تھا۔ میں تلیچ بیگ سے کتراتا رہا۔ ان دنوں تلیچ بیگ سے ملاقات ہوتی تو عجیب عالم ہوتا۔ انہیں دیکھ کر میں اندر ہی اندر تلملاتا، بلبلاتا، لیکن ظاہر ہنستا، مسکراتا اور ان کے لکھے کی تعریف بیان کرتا۔ گو یہ کام بھینس کے انڈے سے روغنِ گل نکالنے کے مترادف تھا، لیکن مجھے اس میں عار نہ تھا کیونکہ ان سے دوستی سیر سپاٹوں کے لیے ضروری تھی ——— بالآخر خواتین نے میری مدد کی جب انہوں نے میری مونچھوں کو یکسر نظر انداز کر کے مجھے اپنی محفل میں برابر کی جگہ دی اور میں نے دو دو جگہ لکھنا شروع کیا، تب کہیں جا کر میری گُڈی چڑھی۔ آخر کار مجھے ایک بڑے اخبار نے اپنے سخنوں میں شامل کر لیا۔

اس پوری جدوجہد کے دوران مجھ پر عجیب عجیب کیفیتیں گذری ہیں۔ کالم نگاری میں تلیچ بیگ کو ٹائیں ٹائیں فش کرایا تو محسوس ہوا کہ ہائے ہم تو شاعری میں رہے جاتے ہیں، فوراً دو تین نظمیں کہہ کر چھپوائیں۔ لوگوں کو یقین دلایا کہ بھیا بھول نہ جانا، ہم قوم کے دردمند شاعر بھی ہیں اور اب ہر طرح کے اناپ شناپ مصرعوں کو نظم کہہ کر اخبار کے بیچ چھپوا سکتے ہیں۔ پھر بیچ بچوں کے لیے نظمیں اور کہانیاں لکھیں۔ ایک کہانی آپ بھی دیکھ لیجیے ——— عنوان ہے۔

"منشی جی کا کلمہ"

"منشی جی بڑے اچھے آدمی ہیں۔ پڑھتے کچھ نہیں، لکھتے خوب ہیں۔ بالا خانے کے ہوادار کمرے میں بیٹھتے ہیں کمرے میں موٹا سا قالین بچھا ہے۔ منشی جی اس کمرے میں بیٹھ کر کھانا نہیں کھاتے، مزدور کی چٹائی کا غم کھاتے ہیں۔ دیکھو وہ سامنے موٹے گدّے والی کرسی پر بیٹھے ہیں۔ گردن تنی ہوئی ہے۔ بہزولوں سے نئی کمانی لگوا کر لائے ہیں، ماسکو میں بہت تلاش کی، ملی نہیں۔ اس وقت منشی جی کلمہ یاد کر رہے ہیں۔ اسے یاد کرنے کے بعد وہ کار میں بیٹھیں گے، غریبوں کی بستی میں جا کر کلمہ سنائیں گے اور کہیں گے، یہ کلمہ نہ پڑھو ——— نیا کلمہ ——— 'روٹی، کپڑا، مکان' یاد کرو۔ اس کے ورد سے موت آسان ہو گی۔ دیکھو منشی جی کو غریبوں کا کتنا خیال ہے۔ پہلے انہیں نیا کلمہ پڑھنے اور صبر کرنے کی تلقین کرتے ہیں، پھر گھر جا کر میز کرسی پر بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں۔"

* *

اس وقت میں صرف ادیب، شاعر اور کالم نگار ہوں، لیکن اپنے آپ سے مایوس نہیں، انشاء اللہ جلد ہی مجسمہ ساز، مصوّر اور موسیقار وغیرہ بھی بن چکا ہوں گا۔ اپنے سب کاموں میں مجھے پسند اپنی کالم نگاری ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اس میں بہترین کرشمے دکھائے جا سکتے ہیں۔ عام طور پر مجھے مذہب اور مذہبی لیڈروں سے چڑ ہے، لیکن مولانا خادم قوم کروڑوی کو میں برداشت کر سکتا ہوں کہ کانگرسی رہ چکے ہیں اور اندر سے سرخا سرخ ہیں۔ میری کالم نگاری کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ مجھے ایمانداری وغیرہ قسم کی بے معنی چیزوں سے کام لینے کا روگ نہیں پالنا پڑتا۔ میں نے اور واضح رہے کہ صرف میں نے انچھیوں کی جنت کا راستہ تلاش کر لیا ہے۔ بس وہاں جاتا ہوں اور ذرا کی ذرا میں کالم گھسیٹ دیتا ہوں۔

لیجیے، اب میں ختم کرتا ہوں۔ شروع میں وعدہ کیا گیا تھا کہ سر دُھننے کا کام بعد میں ہو گا۔ اب آپ سر دُھنیں۔ میں چلا، ابھی افیون خریدنی ہے اور کل کالم لکھنے کے لیے موڈ بنانا ہے۔ وسوی دانیا ——— !!!

مُبصّر کے قلم سے

سعید احمد کی
"کرکٹ بدری"

اکتوبر کا مہینہ کرکٹ کے شائقین کے لیے دو دھماکے لے کر آیا ہے۔ اوّل تو تقریباً سو فیصد خلافِ توقع پاکستانی ٹیم کی کپتانی کے لیے انتخاب عالم کو چنا گیا اور دوسرے ملک کے ایک نامور، ممتاز اور سینئر کھلاڑی سعید احمد کو "ڈسپلن" کے معاملات کی بنا پر ملک کے اندر اور باہر فرسٹ کلاس کرکٹ کھیلنے سے روک دیا گیا۔ پاکستانی کرکٹ کی چھوٹی سی، پژمردہ دنیا میں یہ دونوں واقعات ٹھہری ہوئی جھیل میں دو پتھروں کی طرح گرے ہیں ـــــ اور اب لہروں کا تماشہ قابلِ دید ہے۔ ان دونوں واقعات کا اثر کرکٹ پر کیا پڑے گا، اس کا فیصلہ تو کرنے والا وقت ہی کرے گا، لیکن اتنا ضرور ہے کہ بہت عرصے کے بعد ایک سرگرمی، ایک جوش و خروش اور کچھ کر دکھانے کا گمشدہ جذبہ بروئے کار آتا نظر آتا ہے۔

پاکستانی کرکٹ کا یہ حشر کیوں ہو گیا تھا؟ یہ ایک نہایت اہم سوال ہے۔ اصل میں ہوا یہ کہ پاک ٹیم کا پہلا کپتان بیک وقت ایک اچھا کھلاڑی، ایک اچھا رہبر، ایک اچھا منتظم اور ایک قابلِ تعریف ادیب تھا۔ عبدالحفیظ کاردار کو جس وقت کرکٹ کی کپتانی کے فرائض سونپے گئے تھے ـــــ اس وقت ہماری ٹیم غیر آزمودہ اور کسی قدر نوآموز کھلاڑیوں کی ایک جماعت تھی جس میں معدودے چند کھلاڑی تجربہ کار اور جانے پہچانے تھے۔ ان حالات میں کاردار نے ٹیم میں اس غضب کا جوش اور اعتماد پیدا کیا کہ اس نے اپنی زندگی کے پہلے ہی غیر ملکی دورے میں بھارتی کھلاڑیوں اور تماشائیوں پر اپنی دھاک بٹھا دی۔ امتیاز احمد، وقار حسین، حنیف محمد، فضل محمود، خان محمد، اور نذر محمد کے نام چند ہفتوں کے اندر زبان زدِ خاص و عام ہوئے اور یہ کہنا غلط نہ ہو گا وہ بہت جلد شہرت کی ایسی بلندیوں پر جا پہنچے، جس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔

ان تمام کامیابیوں کا سہرا کسی ایک شخص کے سر نہیں باندھا جا سکتا۔ پوری ٹیم نے ـــــ تمام بولروں نے، بلّہ اندازوں نے اور ـــــ وکٹ کیپر امتیاز نے کمال کر دکھایا تھا ـــــ لیکن اسے ہرگز غلو نہ کہا جائے گا کہ کاردار کی عظیم مقناطیسی اور ہر پہلو سے قابلِ رشک و قابلِ تقلید شخصیت و قیادت کے بغیر یہ معرکے سر نہیں ہو سکتے تھے۔ بلاشبہ عبدالحفیظ کاردار نے ایک نوزائیدہ ملک کی نوآموز ٹیم کو دنیا میں سرافراز و سر بلند کیا۔

ابتدا ہی میں اس قدر اعلیٰ کپتان کا مل جانا پاکستان کے لیے ایک لحاظ سے برا ہی ہوا۔ کاردار کی بھرپور دلچسپی کی بنا پر پاکستان میں کرکٹ کا ارتقاء دھیرے دھیرے ہونے کے بجائے ایک دم اور بڑی تیز رفتاری کے ساتھ ہو گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی ریٹائرمنٹ کے بعد بہت ہی بڑا خلا پیدا ہوا، جسے فضل محمود، امتیاز احمد، حنیف محمد، جاوید برکی، سعید احمد ـــــ کوئی بھی پورا نہیں کر سکا۔ ان کی کپتانی عبدالحفیظ کاردار کی یاد کو ذہنوں سے محو نہ کرا سکی۔ کاردار کے منظر سے ہٹ جانے کے بعد کرکٹ کا اصل اور تدریجی ارتقا شروع ہوا، تو پہلی سی گرما گرمی نہ رہی۔ ٹیسٹ میچ کھیلے جاتے رہے، لیکن شکست یا برابری کے علاوہ نویدِ فتح نہ آئی۔ غیر ملکیوں نے ہمارے بولروں کو خوب پیٹا، اور ہمارے بلّہ اندازوں کے سب کس بل نکال دیے۔ بولنگ کے میدان میں خان محمد اور فضل محمود کی سی جوڑی میسر ہی نہ آئی۔ کچھ محمود حسین نے رنگ جمایا بھی، تو غریب کو ساتھی نہ مل سکا۔ ان تمام باتوں کا نتیجہ وہی ہوا جو ہونا تھا ـــــ کرکٹ کے شائقین کا جوش و خروش کم سے کم تر ہوتا چلا گیا، ٹیسٹ میچ جیسی چیز دیکھنے والوں کی تعداد کم ہو گئی۔ پان کی دکانوں پر نظر آنے والے بڑے بڑے اسکور بورڈ خواب و خیال ہو گئے۔ میچ کے دنوں میں خالی ہو جانے والے دفاتر بھرے پُرے نظر آنے لگے۔ ذوق رکھنے والوں پر ایک پژمردگی چھا گئی ـــــ

ان ہی دنوں جاوید برکی، حنیف محمد اور سعید احمد کے بارے میں عجیب عجیب باتیں سننے میں آئیں۔ انگلستان کے ایک دورے کے سلسلے میں جاوید برکی کو کپتان بنایا گیا تو سب پر اوس سی پڑ گئی ـــــ دورہ تقریباً ناکام رہا ـــــ کوئی قابلِ ذکر کامیابی نہیں ہوئی۔ پھر سعید احمد اور حنیف محمد کے بارے میں یہ خبریں آئیں کہ وہ ایک "ٹیم" کے زور دار بلّہ انداز نہیں رہے بلکہ علیحدہ علیحدہ گروہوں میں شامل ہیں اور ان کے درمیان کرکٹ نہیں، رسّہ کشی چل رہی ہے۔ عبدالحفیظ کاردار نے جس پودے کو اپنے خونِ جگر سے سینچا تھا۔ اسے یہ دن بھی دیکھنا پڑا۔ الامان والحفیظ!

* *

پژمردگی کے ان دنوں میں نیوزی لینڈ کی ٹیم کی آمد کا غلغلہ بلند ہوا ـــــ اور کاردار کے جانے کے بعد پہلی بار ایسی "مجلسِ انتخاب" وجود میں آئی جس کی جانب انگلی نہیں اٹھائی جا سکتی۔ اس مجلس میں خود کاردار، فضل محمود، امتیاز احمد، شجاع الدین اور وزیر محمد جیسے لوگ شامل کیے گئے۔ ابتدا ہی سے امید تھی کہ اس بار کچھ نہ کچھ ضرور ہو کر رہے گا۔ مجلسِ انتخاب نے قائدِ اعظم ٹرافی ٹورنامنٹ اور "نمائشی کھیل" کی مدد سے سولہ کے بجائے اٹھارہ کھلاڑیوں کا انتخاب کیا ـــــ اس کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ کپتانی کے لیے کسے تلاش کیا جائے۔ سعید احمد اور حنیف محمد ـــــ دو سینئر اور مشہور ترین کھلاڑی موجود تھے، لیکن ان کے درمیان "پرامن بقائے باہمی" کا اصول بہت کمزور حالت میں کارفرما تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ انہیں کیونکر نظر انداز کیا جائے، لیکن اس بات پر مجلسِ انتخاب کو مبارک باد دی جائے گی کہ اس نے بہت حوصلے اور جرأت سے کام لے کر حنیف اور سعید کے بعد سب سے سینئر کھلاڑی انتخاب عالم کو قیادت کے لیے منتخب کر لیا اور آصف اقبال کو ان کا نائب مقرر کیا۔

ان کا یہ فیصلہ حیرت انگیز ضرور تھا ـــــ لیکن اس کی ہر جگہ تعریف کی گئی۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ "کرکٹ" کو اب لازمی طور پر ایک دھماکہ درکار تھا ـــــ انتخاب عالم کا چناؤ ایک دھماکے سے کم ہرگز نہیں۔ امید یہ ہے کہ وہ سر دھڑ کی بازی لگا کر کرکٹ کے نیم مردہ جسم میں زندگی کی لہر دوڑا دیں گے۔

انتخاب نے ۵۹ء سے ٹیسٹ کرکٹ کھیلنے کا آغاز کیا۔ وہ ایک مانے ہوئے گوگلی بولر اور دھوم دھام کے بلّہ انداز ہیں۔ حال ہی کی بات ہے قائدِ اعظم ٹرافی کے

فائنل میں ہارتی ہوئی ٹیم کی جانب سے انہوں نے شاندار بلّہ بازی کی۔ وہ جتنی بھی دیر وکٹ پر رہے، رن بناتے رہے ــــ اور دلچسپی برقرار رہی۔ انتخاب عالم ابتدا ہی سے ایک قابلِ اعتماد آل راؤنڈر گنے جاتے ہیں۔ اس حیثیت سے دیکھئے، تو کاردار کے بعد پہلی بار ایک آل راؤنڈر کو کپتانی کے فرائض سونپے گئے ہیں۔ اس خصوصیت کی بنا پر کرکٹ سے عشق رکھنے والوں کی دعا یہ ہے کہ وہ کاردارِ ثانی ثابت ہوں۔ مجلسِ انتخاب میں عبدالحفیظ کاردار کی موجودگی کا تقاضا یہ ہے کہ وہ انتخاب عالم کو ہر لحاظ سے ایک عمدہ کپتان بننے میں مدد دیں، منتخب کھلاڑیوں سے ان کو قابلِ اعتماد تسلیم کرائیں، انہیں ایسی قیادت کے گُر سکھائیں کہ ان کے سارے "جوان" سر جھکا کر، اعتماد کے ساتھ توجہ کے ساتھ اور یقین کے ساتھ تعمیل کریں۔ پاکستانی کرکٹ اپنے دورِ نو کے آغاز کا منتظر ہے۔ کاردار ہی نے اس کے دورِ اوّلین کو تابندگی بخشی تھی۔ وہی اس کی بجھتی ہوئی مشعل کو دوبارہ روشن کر سکتے ہیں۔ اے کاش وہ ماضی کی طرح کامیاب ہوں اور کھیل کا وقار از سرِ نو بلند ہو جائے۔

دوسرا دھماکہ ہے، سعید احمد کے اخراج کا۔ کھیل سے لگاؤ رکھنے والے ان کے رویّے پر حیرت زدہ ہیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ سعید احمد کے سے شاندار بلّہ انداز کے بغیر "بلّہ اندازی" کا شعبہ اپنی روایتی شان کو کیونکر پہنچے گا۔ اس سلسلے میں جو باتیں سننے میں آتی ہیں اور جو کچھ اخبارات میں شائع ہوا ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ غالباً سعید ہی سے کچھ سہو ہو گیا ــــ تاہم اگر ایسا نہ بھی ہوا ہو تب بھی کھلاڑیوں کی شانِ شاہانہ کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنی ذات کو سربلند رکھنے کے لیے کوشش کے بجائے پاکستان کرکٹ کنٹرول بورڈ کو سربلند کرنے کی سعی کریں۔ کوئی ایسی صورت نکالنی چاہیئے کہ سعید احمد سے ہماری ٹیم محروم نہ رہ جائے۔ اندازہ یہ ہے کہ نیوزی لینڈ کی ٹیم کا دورہ پاکستان ــــ پاکستانی کرکٹ کے کارواں کے لیے ایک اہم موڑ ثابت ہوگا۔ اس موقع پر کرکٹ کو سعید احمد کی ضرورت ہے ــــ ایک ایسے سعید احمد کی جو دل و جان سے اپنا شاندار کھیل پیش کرے اور نیوزی لینڈ کے بولروں کو معلوم ہو جائے کہ وہ پاکستان کے تمام بلّہ اندازوں کو چھیاسی نناسی رن دیے کر آؤٹ نہیں کر سکتا۔

* *

کچھ حلقوں میں یہ بات بھی کہی جا رہی ہے کہ ٹیم میں مشرقی پاکستان کا کم از کم ایک کھلاڑی ضرور شامل کیا جانا چاہیئے تھا۔ یہ تجویز جذبۂ ہم آہنگی کی بنا پر تو بہت معقول ہے، لیکن "میرٹ" کے اصول پر پوری نہیں اترتی۔ موجودہ مجلسِ انتخاب کے بارے میں تمام طبقوں اور حلقوں نے مکمل اعتماد کا اظہار کیا ہے اور یہ بات ہے بھی سچ کہ مجلس نے اپنا فریضہ بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ پورا کیا۔ ان حالات میں یہ کہنا کہ کچھ سیاسی اور معاشرتی اسباب کی بنا پر "میرٹ" کا بنیادی اصول ترک کر دیا جائے، کوئی معقول بات محسوس نہیں ہوتی۔ رہی یہ بات کہ ٹیم میں مشرقی پاکستان سے ایک کھلاڑی کو شامل کر لینا بہت بہتر ہوتا اور اس سے وہاں کے کھلاڑیوں کی بہت ہمت افزائی ہوتی، تو غور طلب بات یہ ہے کہ اگر خلوص اور محبت کارفرما ہو، تو مسلسل ناکامی بھی ــــ کامیابی کے لیے شدید محنت اور جانفشانی کا جذبہ پیدا کر سکتی ہے۔ یہاں کوئی مشرقی پاکستان کے کھلاڑیوں کے خلاف نہیں۔ کرکٹ کے شائقین تو ہر قیمت پر اپنی ٹیم کی اعلیٰ کارکردگی دیکھنے کے مشتاق ہیں، وہ تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ پژمردگی کا بھیانک دور ختم ہو جائے۔ خان محمد، فضل محمود اور محمود حسین کے پیرو ــــ مخالف بلّہ بازوں کا جلوس نکال دیں ــــ امتیاز احمد، کاردار اور وزیر محمد کے مقلد مخالف بولروں کو تھکا کر چور کر دیں اور آؤٹ ہونے کا نام نہ لیں ــــ اب یہ لوگ کس صوبے کے ہوں؟ ہم کچھ نہیں جانتے۔ اگر پوری ٹیم مشرقی پاکستان کی ہو اور وہ اس کامیابی کا مژدہ سنا دے، تو کرکٹ کے رسیا اس کی راہوں میں آنکھیں بچھا دیں گے۔ جب تک یہ نہیں ہوتا، اس وقت تک کے لیے ہم کرکٹ کے شائقین سے صرف یہ درخواست کریں گے کہ ــــ کھیلوں کو صوبہ پرستی سے علیحدہ رکھیں۔ کھلاڑی صرف کھلاڑی ہیں ــــ انہیں صوبوں کے خانوں میں رکھنا بڑا ظلم ہے ــــ ان پرندوں کو آزاد چھوڑ دیجئے۔ صوبوں کے کھڑکی بند پنجرے اور دل کے بیے ہوں تو ہوں۔ ان مردانِ حر کے لیے ہرگز نہیں ہیں۔

انجمن دارالعلوم الشہابیہ رجسٹرڈ سیالکوٹ

وہ مثالی ادارہ ہے

جس میں دین و دُنیا کی ہم آہنگی کی بُنیاد پر طلبہ کو علوم و فنون کے ساتھ اسلام آشنا بنایا جاتا ہے اور قرآن و سُنت کے ساتھ ان کا علمی رشتہ استوار کیا جاتا ہے ــــ پہلی جماعت سے دسویں جماعت تک عربی زبان کی لازمی تعلیم ہے ــــ حفظ قرآن اور مدرسہ علوم اسلامی کے بیرونی طلبہ کی کتابوں، خورد و نوش اور علاج کی ذمّہ داری انجمن پر ہے۔ اسکول کے نادار طلبہ کو انجمن وظائف دیتی ہے۔

اس وقت انجمن کی نگرانی میں یہ شعبے کام کر رہے ہیں۔

عربک ہائی اسکول ★ عربک پرائمری اسکول ★ زنانہ ابتدائی مدرسہ ★ شعبہ نشر و اشاعت

دارالافتاء ★ مدرسہ علوم اسلامی ★ مدرسہ حفظ قرآن

طلبہ ایک ہزار کے قریب اور اساتذہ و ملازمین کی تعداد ۳۸ ہے۔

اس عظیم منصُوبے کی کامیابی کے لیے آپ کی دریا دلی کی ضرورت ہے میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ اپنی زکوٰۃ، عطایا اور صدقات کا زیادہ سے زیادہ حصّہ انجمن دارالعلوم الشہابیہ سیالکوٹ کو دے کر اپنا ایمانی تقاضا پُورا کریں۔

محمد علی صدیقی کان اللہ لہٗ

صدر انجمن دارالعلوم الشہابیہ سیالکوٹ

ملک نصر اللہ خان عزیز

باچا خان نے کہا:

"یہ بک بک ہم کب تک سُنے گا؟"

برِصغیر ہند میں تحریکِ خلافت کا غلغلہ بلند ہو چکا تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا شوکت علی، مولانا محمد علیؒ، مولانا حسرت موہانی اور مولانا ظفر علی خان اور ایسے ہی جری، بیدار اور مجاہد پیش رُوؤں نے ملتِ اسلامیہ کو بیدار کرنے کے لیے خون اور پسینے کے جو دریا بہائے تھے ان کا اثر ظاہر ہونے لگا تھا۔ کانگرس جو تیس پینتیس برس سے سیلف گورنمنٹ کے نصب العین کو سامنے رکھ کر قراردادیں منظور کرتی چلی آ رہی تھی، گاندھی جی کی آمد اور تحریکِ خلافت کے اجراء کے باعث نیاز مندی کی روش ترک کر چکی تھی۔ جلیانوالہ باغ کے خونیں سانحے کے باعث پورے ہندوستان میں اضطراب کی لہر دوڑ چکی تھی۔ اسی زمانے میں میں پنجاب خلافت کمیٹی کے ممبر کی حیثیت سے اس کے ایک اجلاس میں شریک ہونے لاہور آیا۔ کمیٹی کا دفتر اس زمانے میں دہلی دروازے کے باہر جامع مسجد محمد شاہ غوث کے متصل، ایک دو منزلہ مکان کی دوسری منزل میں واقع تھا۔ دفتر کے متعدد کمرے تھے۔ ایک کمرہ دفتری کام کیلئے وقف تھا، دو تین مہمانوں اور کارکنوں کیلئے، اور ایک کمرہ شمال کی جانب کمیٹی کے اجلاسوں کے لیے مختص تھا۔ ان کمروں کے درمیان صحن تھا جن میں چارپائیاں پڑی رہتیں اور آنے جانے والے فراغت کا وقت خلافت اور آزادی پر بحثیں کرنے اور حقے کے کش لگانے میں صرف کرتے۔ اسی مکان کی بازار کی طرف والی گیلری میں مرحوم چودھری افضل حق حقہ پیتے اور لکھنے پڑھنے کا کام کرتے تھے۔ "زندگی" اور "دنیا میں دوزخ" اسی جھروکے میں بیٹھ کر تصنیف ہوئیں۔ چودھری صاحب مرحوم نے ایک روز بتایا کہ کتاب کا مسودہ لکھ کر انہوں نے کاتب کے حوالے کیا۔ جب کتابت کے بعد وہ تصحیح کے لیے آیا تو دیکھتے ہیں ایک جگہ عبارت میں یہ الفاظ بھی موجود ہیں:-

کتھے گئے نے ریشمی رومالاں والے نی ہٹے

حیران ہو کر کاتب سے دریافت کیا۔ اس نے جواب دیا، چودھری صاحب میں نے تو آپ ہی کی لکھی پڑھی مارکی ہے۔ مسودہ دیکھا، تو اس میں واقعی حاشیے پر یہ گیت لکھا ہوا تھا۔ معلوم ہوا ایک تانگے والا یہ گیت گاتا جا رہا تھا۔ چودھری صاحب نے سنا، اس کی معنویت سے لطف اندوز ہوئے اور حاشیے میں یادداشت کے لیے لکھ لیا اور کاتب نے اسے بھی کتاب میں ٹانک دیا۔ الغرض یہ تھا دفتر مجلسِ خلافت پنجاب کا۔ اس کے ایک ابتدائی اجلاس میں حاضر ہوا، تو زینے سے چھت پر قدم رکھتے ہی دیکھا ایک کھرّی چارپائی پر ایک شخص دراز ہے۔ سرخ وسفید رنگ، جس کی سرخی سپیدی پر غالب تھی۔ اتنا دراز قد کہ پاؤں پائنتی سے نکل رہے تھے۔ خاکی رنگ کے کھدر کا کرتا اور شلوار زیب بدن تھے اور خاکی رنگ ہی کے کھدر کی چادر لپیٹ کر تکیے کے طور پر سر کے نیچے رکھی تھی۔ چہرے کے نقوش بڑے تیکھے، ناک بلند اور خمدار۔ خشخشی سی داڑھی، سر تقریباً گھٹا ہوا۔ میں اسے ایک مہمان سمجھا جو خلافت کے لیڈروں سے ملاقات کے لیے آیا ہے اور پاس کے کمرے میں داخل ہو گیا جہاں صوبائی مجلسِ خلافت کا اجلاس ہو رہا تھا۔ مولانا عبدالقادر قصوری صدارت کر رہے تھے۔ ان کے پہلو میں ایک طرف آغا محمد صفدر جنرل سیکرٹری، دوسری طرف ملک لال خاں (سیکرٹری) اور رانا فیروز الدین (سیکرٹری) تشریف فرما تھے۔ گول سے دائرے میں ارکانِ مجلس تھے اور کسی مسئلے پر گرما گرم بحث ہو رہی تھی۔ اس زمانے میں مولوی مظہر علی، چوہدری افضل حق، مولانا حبیب الرحمان اور دوسرے حضرات جو بعد میں قومی تحریکات میں نمایاں ہو کر ابھرے، مجلس خلافت کی بحثوں میں خوب حصہ لیتے تھے۔ غازی عبدالرحمان نکتے پیدا کرتے، مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی دلائل دیتے، چوہدری افضل حق تدبیر و تدبّر کی عقدہ کشائی کرتے۔ جو مسئلہ یا تجویز پیش ہوتی اس کو خوب چھان پھٹک کر طے کیا جاتا۔ جس روز کا میں ذکر کر رہا ہوں، اس روز صوبے میں کام کے سالانہ منصوبے کی تفصیلات طے کی جا رہی تھیں، تاکہ ماتحت مجالس کے دفاتر کو ارسال کر دی جائیں اور کارکنانِ خلافت اس کے مطابق دوروں کا پروگرام بنائیں۔ ایک ایک شق پر دھواں دھار تقریریں جاری تھیں۔ ہر شق کے حسن و قبح پر بحث ہو رہی تھی، مگر کوئی آخری فیصلہ نہیں ہو رہا تھا۔ کوشش کی جا رہی تھی کہ سب ارکان کے اطمینان کی صورت میں اتفاق کر لیا جائے۔ صرف شدید ضرورت پر ہی رائے شماری کی نوبت پیش آتی تھی۔ جب بحث و مذاکرہ میں خاصی دیر ہو گئی، تو میں نے دیکھا کہ وہی لمبا تڑنگا سرخ و سفید شخص جسے میں باہر کھرّی چارپائی پر لیٹا ہوا دیکھ کر آیا تھا۔ دروازے میں نمودار ہوا اور اس نے کہا:-

"او بائی تم نے کوئی فیصلہ کر لیا!"

جواب ملا، خان صاحب ابھی کسی آخری نتیجے پر نہیں پہنچے، تھوڑی دیر اور لگے گی۔ خان صاحب یہ سن کر واپس چلے گئے۔ میں نے ایک ساتھی سے پوچھا: یہ کون صاحب ہیں؟ انہوں نے بتایا، صوبہ سرحد کے جناب عبدالغفار خاں ہیں، خدائی خدمت گار تنظیم کے رہنما۔

خان صاحب پھر اسی طرح چارپائی پر جا لیٹے۔ کوئی نصف گھنٹے کے بعد وہ پھر آئے اور بولے:

او بائی ہم انتظار کرتے کرتے تھک گیا ہے۔ تم ہمیں پروگرام بتاؤ تاکہ ام جا کر کام کرے۔ یہ بک بک بک ہم کب تک سنے گا۔

خان صاحب کے ان الفاظ سے میں سمجھ گیا کہ یہ شخص ہمارے علاقے کے لیڈروں سے کچھ مختلف قسم کا آدمی ہے۔ تقریروں کے بجائے کام کا شوقین ہے۔ بحثوں میں زیادہ وقت گزارنے سے زیادہ اپنا وقت کام میں صرف کرنا پسند کرتا ہے۔ اب یاد نہیں پروگرام کی بحث کب ختم ہوئی اور عبدالغفار پروگرام کو لے کر کب واپس گئے؟ میں نے انہیں صوبے کی مجلسِ خلافت کے کسی اجلاس میں پھر نہیں دیکھا۔ سنتا رہا کہ صوبہ سرحد میں خدائی خدمتگاروں کا طوطی بول رہا ہے، پورے صوبے کے کونے کونے میں اس کی آواز پہنچ چکی ہے۔ اس تنظیم کا اصل پروگرام مجلسِ خلافت کے پروگرام سے مختلف تھا۔ سیاسی کم اور سماجی زیادہ۔ عبدالغفار خاں اپنے صوبے کے باشندوں کو معاشرتی اور اخلاقی اصلاح کے ذریعہ منظم کر رہے تھے اور پٹھانوں کو جن مفاسدِ اخلاق و معاشرت نے تباہ کر رکھا تھا، ان کو دور کر رہے تھے۔ اصلاحِ رسوم، مسرفانہ زندگی سے اجتناب اور خاندانی اور رقابتی جھگڑوں کو گولی کے بجائے مصالحانہ تدابیر

سے حل کرنے کی عادت ڈال رہے تھے۔ ان کا کام بظاہر بالکل غیر سیاسی تھا، مگر انگریزی حکومت کے کارپردازوں کی دور بین نگاہ تاڑ رہی تھی کہ اس بے خروش سرگرمی کی تہہ میں طوفان پوشیدہ ہے۔ اس نے خدائی خدمت گاروں کو طرح طرح سے تنگ کرنا شروع کر دیا اور مجھے دلی افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس نے اس کام کے لیے ان افروں سے کام لینے کی کوشش کی جو پنجاب کی خاکِ پاک سے اٹھے تھے۔ انگریزوں نے ابتدا ہی سے اپنی سلطنت کی توسیع کے لیے پنجاب کے بازوئے شمشیر زن کو استعمال کیا تھا۔ جب پنجابی فوجوں کے ذریعے وہ کسی علاقے کو فتح کر لیتے، تو اس کو بحق برطانیہ محفوظ کرنے کے لیے پنجاب ہی سے سول اور پولیس کی نفری منگاتے۔ یہ لوگ مقامی باشندوں پر برطانوی اقتدار کا رعب قائم رکھنے کے لیے "شاہ سے زیادہ وفادار" محاورے پر عمل کرتے، چنانچہ اس برطانوی پالیسی ہی کا نتیجہ تھا کہ برٹش انڈیا کے ہر علاقے میں "پنجابی" خطرے کی علامت سمجھا جاتا۔ میں نے برما کے لوگوں کو پنجابیوں کا شاکی پایا۔ دکن کے علاقوں میں پنجابیوں ہی کے خلاف تعصب محسوس کیا۔ یوپی بہار میں بھی پنجابی بدنام تھا۔ سندھ اور بلوچستان تو آج تک اس بدنصیب کو معاف نہیں کر سکے۔ جس طرح مشرقی پاکستان میں آج بہاری اور پنجابی مشکوک ہے، اس لیے کہ قیام پاکستان کے وقت اس بازوئے پاکستان کی انتظامی ضرورت کے لیے یوپی بہار اور پنجاب وغیرہ ہی کے افسر اور انتظامیہ کے ارکان بھیجے گئے تھے اور مقامی لوگوں کو بیورو کریسی سے جو شکایات پیدا ہوئیں وہ تمام غیر بنگالیوں کے سر منڈھ دی گئیں، اسی طرح انگریزوں کے دور میں مقامی لوگوں پر اعتماد کرنے کے بجائے ابتدا میں پنجاب سے انتظامیہ درآمد کی گئی اور اس کی سب بدعنوانیاں پنجاب کے نامۂ اعمال میں لکھ دی گئیں؛ حالانکہ خود اس صوبے کے باشندے اپنے ہی بھائی بندوں کے ہاتھوں کچھ کم نالاں نہیں تھے۔

بہر حال وہ دور گزر گیا۔ تحریکِ خلافت کا ساقی رخصت ہو گیا، اس کے قدحِ تنظیم کے ٹکڑے ہو گئے۔ تحریکِ عدمِ تعاون پر ہندو مسلم فسادات کا خونیں سایہ مسلط ہو گیا۔ میں نے بھی اس دور کی میدانی جدوجہد سے کنارہ کیا اور صحافت کی وادیِ گلرنگ میں کھو گیا۔ اخباروں سے خان عبدالغفار خاں کی سرگرمیوں کی خبریں معلوم ہوتی رہیں۔ کس طرح ۳۰ء میں قصہ خوانی کے بازار میں خدائی خدمت گاروں پر گوروں نے گولی چلائی اور سینکڑوں پٹھان نوجوانوں کو خاک و خون میں تڑپا دیا، کس طرح نمک کی ستیہ گرہ کے زمانے میں صوبہ سرحد ایک کوہ آتش فشاں بن گیا تھا اور ہزاروں گھر اجڑ گئے۔ عبدالغفار خاں، ان کے بھائی ڈاکٹر خان صاحب اور ان کے ممتاز ساتھی جیل میں ڈال دیئے گئے اور خدائی خدمت گاروں کی تنظیم براہِ راست کانگرس میں شریک ہو گئی۔ عبدالغفار خاں، مہاتما گاندھی کے چیلے بن گئے۔ خدائی خدمت گار انہیں بادشاہ خاں کہتے تھے اور باچا خاں کے نام سے پکارتے تھے، مگر صوبہ سرحد سے باہر ہندوستان میں وہ سرحدی گاندھی کے لقب سے معروف تھے۔

سرحدی گاندھی اور بادشاہ خان، یہ دونوں عرف بالکل متضاد ہیں، مگر خان عبدالغفار خاں کی سیاسی ضرورت ان دونوں کی متحمل تھی۔ عبدالغفار خاں بڑے کام کے آدمی تھے۔ انگریزی حکومت نے اپنے طرزِ عمل سے انہیں کانگرس کی گود میں ڈال دیا اور اس وقت کے مسلمان لیڈروں کی کمزوری کے باعث وہ کسی مسلمان تنظیم سے وابستہ نہ ہو سکے۔ انہوں نے اس حادثے کی جو توجیہہ خود پیش کی، وہ یہ ہے کہ جب برطانوی حکومت نے ان کی تنظیم کو ظلم و تشدد کا نشانہ بنایا تو انہوں نے گجرات جیل سے اپنے چند ساتھیوں کو ہدایت کی کہ وہ جا کر مسلمان سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں سے درخواست کریں، مگر وہ جہاں گئے وہاں سے انہیں یہ جواب ملا کہ تشریف لے جایئے، کہیں ہم بھی مبتلائے مصیبت نہ ہو جائیں اور سرکار انگریزی کہیں ہماری بھی دشمن نہ بن جائے۔ سب طرف سے مایوس ہو کر کانگرسی لیڈروں سے ملے۔ انہوں نے فوراً ایک تحقیقاتی کمیٹی مسٹر وٹھل بھائی پٹیل کی صدارت میں تشکیل کر دی۔ یہ کمیٹی فوراً صوبہ سرحد کی طرف روانہ ہو گئی، مگر صوبہ سرحد کی حکومت نے اس کا داخلہ صوبے میں بند کر دیا اور اٹک کے پل ہی سے واپس کر دیا۔ پٹیل کمیٹی راولپنڈی واپس آئی اور وہیں اس نے تحقیقاتی کاروبار کی بساط بچھا دی۔ تھوڑی ہی مدت میں شب و روز کام کر کے ایک ضخیم رپورٹ تیار کی۔ صوبہ سرحد کی حکومت کے ظلم و تشدد کی ایسی داستانیں مستند شہادتوں کے ساتھ اس کے اوراق میں جمع تھیں کہ کہرام مچ گیا۔ برطانوی حکومت کی تمام شاہانہ اور امپیریل روایتوں کے باوجود ایسے عناصر اس کے اندر موجود تھے جو سلطنت کے مفاد ہی کی خاطر حکومت کے کارپردازوں کی بدعنوانیوں کا سختی سے نوٹس لیتے تھے اور پارلیمنٹ میں ان کی سرکاری کارگزاری کے ایسے بخیے ادھیڑتے تھے کہ برسرِ اقتدار پارٹی حکومت ہند کے کان کھینچنے پر مجبور ہو جاتی تھی۔ لارڈ وارن ہیسٹنگز کی جو گت مشہور مقرر ایڈمنڈ برک نے دو سو سال قبل بنائی تھی اور پھر جنرل ڈائر اور سر مائیکل اوڈوائر کے جو لتے۔ بیسویں صدی کے ربعِ اوّل میں لیے گئے تھے، وہ تاریخ کا نوشتہ تھے، چنانچہ ہر چند پٹیل کمیٹی کی رپورٹ کی اشاعت کو حکومتِ ہند نے ممنوع قرار دے دیا اور اس کا کوئی نسخہ پاس رکھنا بھی جرم ٹھہرا دیا، مگر اس کے مندرجات سے انگریز حکام دنیا کے سامنے ذلیل و رسوا ہو کر رہ گئے۔ صوبہ سرحد جسے مولانا ظفر علی خاں مرحوم نے سرزمینِ بے آئین کا لازوال خطاب دے دیا تھا، پہلے کی طرح بے بس اور کس مپرس نہ رہا۔ پورے ہندوستان کی تحریکِ آزادی کا سیاسی وزن صوبۂ سرحد کی سیاسی زندگی کے پلڑے میں بھی پڑ گیا اور خدائی خدمت گاروں کے ساتھ معاملہ کرنے میں صوبہ سرحد کی حکومت محتاط ہو گئی۔ بادشاہ خاں کی "مراد" مل گئی۔ انہیں مستقبل کے بارے میں اپنی جماعت کی سیاسی پالیسی مرتب کرنے میں داد مل گئی۔ اب انہوں نے کانگرس میں شرکت کر کے خود کو پورے ملک کی سیاسی تحریک کا ایک جزو بنا لیا، ایک طرح سے ان کو ایک پناہ ہی دستیاب ہو گئی۔ جس طرح ایک قلیل التعداد اور کمزور فوج اپنے زبردست حریف کی زد سے بچنے کے لیے خود کو کسی بڑی فوج کا حصہ بنا لیتی ہے اور تنہا مار کھا کر ہلاک ہونے سے بچ جاتی ہے، اسی طرح خان عبدالغفار خاں حکومتِ ہند کی چیرہ دستیوں سے کانگرس کی امان میں آ گئے۔ اب ان کے ساتھ بھی وہی سلوک ہوتا، جو دوسرے صوبوں کے سیاسی کارکنوں کے ساتھ ہو سکتا تھا۔ گاندھی جی اور کانگرس کو بھی ایک دلیر اور بہادر فوج مل گئی، چنانچہ مستقبل کی ان جنگوں میں جو کانگرس نے حکومتِ ہند کو زچ کرنے کے لیے لڑیں ان میں صوبہ سرحد کے خدائی خدمت گار جو گولی اور بندوق سے بات کرنے کے بجائے اب چرخے اور عدمِ تشدد کی زبان سے گفتگو کرنے لگے تھے، ہندوستان کے دوسرے صوبوں سے زیادہ مددگار ثابت ہوئے۔ واقعہ یہ ہے کہ مسلمان قوم کی فطرت میں اللہ تعالیٰ نے ایک قوت رکھی ہے، وہ جس میدان میں بھی داخل ہوتی ہے دوسری قوموں سے زیادہ فعال، بے دھڑک اور موثر ثابت ہوتی ہے۔ کہتے ہیں نپولین نے کہا تھا اگر مجھے ایک ترک بریگیڈ مل جائے تو میں پوری دنیا کو فتح کر سکتا ہوں۔ یہ بات کسی غلط فہمی کی بنا پر نہیں کہی گئی تھی، اس کو صرف ترکوں کا علم تھا، اگر وہ دنیا کے دوسرے حصوں کے مسلمانوں کو دیکھتا تو ان کے بارے میں بھی یہی کہتا۔ میرے تجربے کے مطابق عبدالغفار خاں کی سیاسی پالیسی یہ تھی کہ وہ صوبہ سرحد میں تو بادشاہ خاں تھے، یعنی مسلمانوں کی شاہ پسندی کی نفسیات کا مظہر اور باقی ہندوستان میں وہ سرحدی گاندھی، اہنسا کے پجاری؛ جو باتیں ہندو ذہنیت کے من

کو جیت سکتی تھیں وہ ان کا اظہار کرتے تھے۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر پرنام کرنا، خود کو گاندھی جی کا چیلا قرار دینا۔ اگر خان عبدالغفار خاں خفا نہ ہوں تو میں کہوں گا کہ ان کی روش صرف ایک سیاسی تدبیر تھی۔ ان کا اصل ہدف صوبہ سرحد کی چار دیواری تھی۔ جس کے اندر وہ اپنے اقتدار کے خواب کو پورا ہوتے دیکھ رہے تھے۔

مجھے اس حقیقت کا اندازہ ۱۹۳۱ء کی شام ہی کو ہو گیا تھا۔ گاندھی اروِن صلح کے بعد نیشنلسٹ مسلم کانفرنس کی سالانہ کانفرنس میرٹھ میں منعقد کی گئی۔ ڈاکٹر انصاری مرحوم نے اس کی صدارت کرنا تھی، مگر وہ کسی وجہ سے نہ آسکے۔ ڈاکٹر سیّد محمود نے فرائضِ صدارت انجام دیئے۔ میں ا نہی دنوں جیل سے آزاد ہوا تھا۔ ایک نیشنلسٹ مسلمان کی حیثیت میں اور "مدینہ" بجنور کے ایڈیٹر کے طور پر اس کانفرنس میں شریک ہوا۔ میں جب جلسہ گاہ کی عمارت میں پہنچا تو مجھے اس کمرے میں پہنچا دیا گیا جہاں لیڈر حضرات تشریف فرما تھے۔ میں نے دروازے کی دہلیز میں قدم رکھا ہی تھا کہ ڈاکٹر محمود صاحب نے پکار کر فرمایا "آیئے، آیئے عزیز! آپ ہی کا تذکرہ ہو رہا تھا۔ میں نے کہا، الحمدُللہ کہ:

ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے۔

فرمایا "برائی سے نہیں، بھلائی سے ہے، یہاں گفت گو اس بات پر ہو رہی تھی کہ اخبار "مدینہ" کی روش بھی خوب ہے کہ اسے دشمن بھی اسی رغبت و اہتمام سے پڑھتا ہے، جس ذوق و شوق سے اس کے مسلک کے حامی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ دلیل سے بات کرتے ہیں۔ اختلاف کرنے والوں کی نیت پر حملہ نہیں کرتے۔ ان کے استدلال کی کمزوری واضح کرتے ہیں اور مخاطب کو برہم نہیں کرتے"۔ یہ اس محفل کی پہلی بات تھی۔ اسی روز شام کو کھانے کا دستر خوان بچھا۔ اتفاق سے مجھے وہاں جگہ ملی جہاں میرے بائیں ہاتھ کو ڈاکٹر محمود صاحب تشریف فرما تھے اور بالکل سامنے خان عبدالغفار خاں براجمان۔ کھانے کے دوران میں حسب معمول سیاسی بات چیت بھی ہوتی رہی۔ گفت گو کا رخ اس ستیہ گرہ کی طرف مڑ گیا جو نمک سازی کے سلسلے میں شروع ہوئی تھی اور جس کا خاتمہ گاندھی اروِن کے مابین صلح کی صورت میں ہوا۔ کانگرسی ہندوؤں نے پہلی مرتبہ یہ محسوس کرنا شروع کیا کہ وہ برطانوی حکومت کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر سکتے ہیں اور ان کی روش اور طرزِ عمل کے قدم معاً ہندو قومیّت کے برملا اظہار کی طرف مڑ گئے تھے۔ ان کے دلوں میں پہلے بھی ہند قومیّت کا جذبہ موجزن تھا، مگر وہ اس کا اظہار کرتے ہوئے اس خیال سے ڈرتے تھے کہ جو مسلمان کانگرس کی تقویت کا باعث ہیں، کہیں وہ بگڑ نہ جائیں، مگر اب انہوں نے اس رکھ رکھاؤ کو بھی ترک کر دیا اور ہندو تہذیب، ہندی زبان اور ہندو دیت کو رواج دینے والی سرگرمیوں کا اظہار کرنا شروع کر دیا، اور دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں فاصلہ بہت کم رہ گیا۔

اس ستیہ گرہ میں، جس کا نتیجہ کانگرسی ہندوؤں کے مطابق مہاتما گاندھی کی فتح کی صورت میں نکلا تھا، مسلمانوں نے کچھ کم حصہ نہیں لیا تھا۔ قید و بند کو لبیک کہنے اور قانون شکنی اور جانی و مالی قربانی پیش کرنے میں مسلمان عددی اعتبار سے کسی دوسری قوم سے پیچھے نہیں تھے، لیکن چونکہ بحیثیتِ قوم وہ کانگرس کی تحریک سے نہ صرف الگ تھے، بلکہ ایسی جماعتیں نمودار ہوتی رہتی تھیں جو سول نافرمانی کی مخالفت کا دعویٰ کرتی تھیں، اس لیے ہندو اور انگریز دونوں یہ سمجھتے تھے کہ گاندھی کی فتح میں مسلمانوں کا کوئی حصہ نہیں؛ حالانکہ تنہا صوبہ سرحد میں ۵ ہزار فرزندانِ اسلام نے انگریزی حکومت کی دیواروں کو منہدم کرنے کے لیے قیدیوں کی وردی پہن لی تھی۔ جس محفلِ طعام کا میں ذکر کر رہا ہوں اس میں جب نمک کی ستیہ گرہ کا ذکر چھڑا، تو قدرتی طور پر بات خان عبدالغفار خاں صاحب کی خدمات تک پہنچی۔ ڈاکٹر صاحب نے خان صاحب کو مخاطب کر کے فرمایا، "خان صاحب، اس مرتبہ تو آپ کے صوبے نے ۵ ہزار رضا کار تحریکِ آزادی کے لیے جیلوں کی نذر کیے، آئندہ مجھے امید ہے کہ آپ کا صوبہ پچاس ہزار رضاکاروں کی قربانی دے گا۔

جب اس قسم کی گفت گو شروع ہوتی ہے، تو عام انسانی نفسیات یہ ہے کہ مخاطب اس کو اپنے لیے خوشنودیِ مزاج اور اعترافِ خدمات کی سند سمجھتا ہے اور اسی انکسار کے ساتھ اس کو قبول کرتا ہے کہ نہیں، "ڈاکٹر صاحب! اس میں تعریف و تحسین کی کیا بات ہوئی۔ یہ تو ہمارا فرض تھا اور انشاءاللہ آئندہ ہم آپ کی توقعات کو پورا کرنے کی کوشش کریں گے۔ ڈاکٹر محمود صاحب اس زمانے میں انڈین نیشنل کانگرس کے سیکرٹری تھے اور ان کی بات کا جواب اسی نوع کا ہو سکتا تھا۔ میں نے بھی اپنے دل میں قیاس کیا تھا کہ خان صاحب جواب میں کہیں گے کہ "ڈاکٹر صاحب آپ اطمینان رکھیں، ہم پچاس ہزار سے زیادہ افراد کی قربانی پیش کریں گے" مگر خان صاحب نے ان کو جو جواب دیا اسے سن کر میں بالکل حیرت زدہ ہو گیا۔ انہوں نے کہا "ارے بابا! ہم کو معاف کرو، ہم آپ لوگوں سے سخت تنگ ہے۔ اپنا کھاتا ہے اپنا پیتا ہے، اپنے پیسے سے سفر کرتا ہے اور انقلاب اخبار میں لکھ دیا جاتا ہے کہ ہمیں کانگرس پیسہ دیتی ہے۔ ہم تو صرف اپنی قوم کو جانتا ہے، وہ ہم پر اعتماد کرتی ہے۔ ایک ہزار انقلاب بھی اٹک کے اس پار کے لوگوں کو ورغلا نہیں سکتا۔" آج ۴۰ برس کے بعد یہ تو ممکن نہیں کہ خان صاحب کے تمام الفاظ مجھے یاد رہ سکے ہوں، مگر ان کے جواب کا مفہوم یہی تھا، اور وہ اس لیے مجھے یاد رہ گیا کہ میں اس قصے کو کئی مرتبہ اپنے احباب کی محفلوں میں بیان کر چکا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب تو اس جواب کو سن کر ایک طرح سے بجھ کر رہ گئے، مگر مجھ پر یہ حقیقت منکشف ہو گئی کہ عبدالغفار خاں کی کانگرس میں شرکت کی غرض یہ ہے کہ وہ صوبہ سرحد میں اپنے مستقبل کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ کانگرس ان کے لیے ایک مورچہ ہے، جس میں پناہ لے کر وہ اپنی منزل کی طرف بڑھنا چاہتے ہیں۔

اس کے بعد کانگرس اور انگریزی حکومت کے مابین اقتدار کی کش مکش نے مختلف روپ بدلے، کبھی گاندھی جی کو انگلستان بلا کر رام کرنے کی کوشش کی گئی اور کبھی آغا خاں پیلس میں نظر بند کر کے انہیں موت و حیات کی برزخی منزلوں سے گزارا گیا۔ یہاں تک کہ وزیرِ ہند نے اپنا مشہور ایوارڈ دیا اور اندرونی خود مختاری کا تحفہ عطا کیا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی فرقہ وارانہ کش مکش نے ایک نیا رنگ اختیار کر لیا۔ صوبوں میں مخلوط وزارتیں قائم ہوئیں، ہندو اکثریت کے صوبوں میں کانگرس برسرِ اقتدار آئی اور ہندوؤں کا سیاسی نقطہ نگاہ عملی صورت میں نمودار ہو گیا۔ اس سے قبل ہندو اور مسلمان لیڈروں کی یہ کوشش تھی کہ حقوق کا ایسا بٹوارہ ہو جائے کہ بدیشی اقتدار کے رخصت ہونے کے بعد دونوں قومیں مل جل کر ملک کے انتظام میں حصہ لے سکیں، مگر اب محسوس ہونے لگا کہ یہ ایک ناممکن العمل تصور ہے۔ کچھ عرصے کی دستوری اکھاڑ پچھاڑ کے بعد علاقوں کی از سرِ نو نقشہ بندی کے منصوبے سامنے آئے، لیکن مسلمانانِ ہند کا عمومی اتفاق کسی بات پر نہ ہوتا تھا، یہاں تک کہ مسلمان اکثریت کے علاقوں میں ایک ایسی اسلامی سلطنت کے قیام کا تصور ابھر کر سامنے آ گیا جس میں اسلام کے مطابق مسلمانوں کو نظامِ زندگی قائم کرنے کا اختیار حاصل ہو گا۔ اور پوری مسلمان قوم یکایک اس طرح جاگ اٹھی گویا اس نے کوئی نہایت خوشگوار خواب دیکھا ہے۔ اس نصب العین پر اتفاق ہو گیا، لیکن عبدالغفار خاں اور ان کی جماعت اس سے اتفاق نہ کر سکی، یہاں تک کہ ملک تقسیم ہو گیا، پاکستان قائم ہو گیا، اگر عبدالغفار خاں اس وقت خالی الذہن ہو

کر فیصلہ کرتے، تو ان کو ملت کے اس فیصلے کے سامنے خوش دلی کے ساتھ سر جھکا دینا چاہیے تھا، لیکن وہ ایسا نہ کر سکے، کیونکہ صوبہ سرحد اب پاکستان کا ایک صوبہ تھا اور اس میں ان کی حیثیت سرحدی گاندھی کی تھی، بادشاہ خاں کی نہیں تھی۔ میرا وجدان کہتا ہے، اگر ملک کی سیاسی تقدیر کا فیصلہ یہ ہوتا کہ ملک تقسیم نہ ہو اور خدانخواستہ پورا ملک کانگرس راج میں آجاتا، تو پھر بھی خان عبدالغفار خاں صوبہ سرحد کو پختونستان میں تبدیل کرنے کا مطالبہ کرتے، جیسا کہ انہوں نے حکومت پاکستان سے کیا، مگر ان کا انجام کانگرس راج میں بھی یہی ہوتا۔ اس قیاس کی تائید اس بات سے ہوتی ہے، کہ پنڈت نہرو نے اپنے قدیم دوست شیخ محمد عبداللہ کے ساتھ اس وقت تک رواداری برتی جب تک انہیں یقین رہا کہ شیخ صاحب کشمیر کو بھارت کی آغوش میں دینے پر رضامند ہیں۔

آخر میں ایک لفظ خاں صاحب کی گاندھویت کے متعلق بھی لکھ دیا جائے، تو بہتر ہے۔ میں ہمیشہ ان کی سیاسی استقامت کا مداح رہا ہوں۔ ان کی رائے اور مسلک سے اختلاف کے باوجود ان کے صبر و ثبات، قوتِ عمل، اپنے مسلک پر ان کی پامردی کا اعتراف کرتا اور ان کو غالب کے اس شعر کی عملی تصویر سمجھتا رہا ہوں کہ —

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

لیکن حال ہی میں اپنے سفرِ بھارت کے دوران انہوں نے اپنے ذہن کی حقیقی تصویر سے جو پردہ اٹھایا ہے اس سے کم از کم ان کی گاندھویت کا بت پاش پاش ہو کر رہ گیا ہے۔ میں نے ان کی خود نوشت سوانح عمری کا مطالعہ نہیں کیا۔ چند روز ہوئے اس کے کچھ اقتباسات ایک اخبار میں دیکھے تھے۔ ان سے محسوس ہوا کہ وہ علاقائی تعصبات میں مبتلا ہیں۔ ان کو پنجابیوں سے سخت شکایت ہے اور اب دہلی کی تقریروں میں انہوں نے اپنے نظریۂ پختونستان کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ صرف اس لیے پختونستان کے طلب گار ہیں کہ پنجاب کی بالادستی سے نجات پا جائیں۔ یہ نقطۂ نگاہ جو نفرت پر قائم ہے، سراسر تشدد پر مبنی ہے اور خاں صاحب بہرحال خود کو عدمِ تشدد اور اہنسا کا معتقد قرار دیتے ہیں۔ اصل میں قصہ وہی بادشاہ خانی کا ہے۔ یہ شروع سے ان کی زندگی کا مطمحِ نظر تھا۔

حرفِ بے لاگ

ٹیلی ویژن

کیا یہی ”خدا کی بستی“ ہے؟

زیرِ نظر گزارشات ”خدا کی بستی“ کے صرف مرکزی خیال (CENTRAL IDEA) تک محدود ہیں، اس سے ہٹ کر ناول پر بحیثیت مجموعی ایسا تبصرہ جس میں اس کے تمام پہلوؤں کو زیرِ بحث لایا جائے، مقصود نہیں۔ اسی طرح ٹی، وی پر اس کی نمائش کے سلسلے میں جن فنی خوبیوں کا مظاہرہ کیا گیا ہے ان پر بھی تنقید خارج از موضوع ہے۔ تاہم یہ سراسر ناانصافی ہوگی، اگر اس سلسلے میں اس کاوش اور نظر کی داد نہ دی جائے، جس کی وہ مستحق ہے۔ ٹی۔وی پر اس کی نمائش کامیاب رہی اور ہر فرد —— اداکاروں سے لے کر ٹی۔وی کا تمام متعلقہ عملہ ستائش کا مستحق ہے۔ شاید یہ پہلی پیشکش ہے جو اس اعتبار سے کامیاب ہے۔

اس تبصرہ کی چنداں ضرورت نہ ہوتی، اگر ناول کا نام ”خدا کی بستی“ کی جگہ کچھ اور ہوتا۔ جہاں یہ نام اپنی جگہ تشریح طلب ہے۔ وہاں وہ مرکزی خیال بھی اسی قدر لائق توجہ ہے، جو شاید ابھی تک یا تو اوجھل ہے، یا معروف ہوتے ہوئے اس جہت کی نشان دہی کرنے سے قاصر ہے، جہاں تمام ”برائی“ یا ”معصیت“ کی جڑ ”افلاس و غربت“ ہے۔ تاریخ سے اس دعوے کی کہاں تک تصدیق ہوتی ہے، یہ ایک مختلف مسئلہ ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ایک مسلم معاشرے میں اس دعوے کے لیے کوئی جواز ممکن ہے یا نہیں اور، اگر ممکن ہے، تو اس کا ذمہ دار کون ہے؟ افلاس —— ؟ جو کسی مادی عمل اور ردِ عمل کا نتیجہ ہے یا اسلام، جو کسی مادی عمل کا ردِ عمل نہیں!

اس حد بندی پر ہم اس لیے مجبور ہیں کہ ناول کا نام ”خدا“ سے شروع ہونے کی وجہ سے اس نسبت کو ظاہر کرتا ہے جو اس کی ذات اور اس کے بندہ پر فرداً فرداً اور اجتماعی اعتبار سے احاطہ پذیر ہے۔ اس نام کی بنیاد پر جو پس منظر (PERSPECTIVE) مدِ مقابل ہو گا کیا، وہی ناول میں پیش کیا گیا ہے —— ؟ یقیناً نہیں نہیں۔ ذرا غور کیجئے، چوروں کی بستی کا نام ساہو کاروں کی بستی رکھ دیا جائے، تو عقل کیا سمجھے گی؟ ہر اسم اپنی صفت سے معروف ہوتا ہے۔ خدا کی صفت اگر ”خدا کی بستی“ ہو سکتی ہے، تو یقیناً شیطان کی بستی بھی، اس منفرد معنی اور طنز کے پیشِ نظر، رحمٰن کی بستی بن سکتی ہے:

سوال یہ ہے کہ یہ طنز کس پر ہے؟ انسان یا خدا پر اگر انسان پر ہے، تو ”خدا“ کا استعمال، غلط، غیر منطقی اور گمراہ کن ہے۔ یہ اس لیے کہ جب انسان خود اپنے عمل کا جواب دہ ہو تو برائی کو خدا سے منسوب کرنا نہ صرف نادانی بلکہ امرِ واقعہ کے خلاف اور بالکل غیر منطقی حرکت ہوگی۔ اس کے برعکس، اگر خدا پر ہی براہِ راست یہ طنز ہے تو خود اس کی نفی انسان کے ان تمام اعمال سے ثابت ہے، جو اس ناول کے کم و بیش ہر کردار سے صادر ہوئے۔ ہر کردار خواہ وہ کسی اہمیت کا حامل ہے یا نہیں، مجسم ایک برائی ہے۔ ان کے نام محض اضافی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے ”بدی“ نے مختلف قالب اختیار کر لیے ہیں اور وہ اپنے مرکز کے تابع گردش کر رہے ہیں۔ حقیقت سب کی ایک ہے

جب یہ دونوں صورتیں ممکن نہیں، تو پھر "خدا کی نفی" کا مفہوم کیا ہے؟ یہ غالباً دو دھاری تلوار ہے، جو ایک طرف خدا کی نفی کرتی ہے اور دوسری طرف ان تصورات کی، جن کی اساس کسی آسمانی کتاب پر موقوف ہے اور اس کی شہادت ناول کے وہ تمام کردار فراہم کرتے ہیں جن کے توسط سے عصرِ حاضر کے مسلم معاشرے کی نمائندگی کی گئی ہے۔

تاریخ سے ناواقف شخص اگر اس "نمائندگی" کو دیکھے، تو مسلم معاشرے کی جو تصویر اس کے سامنے آئے گی، وہ محتاجِ بیاں نہیں۔ اسے اس معاشرہ سے جس قدر نفرت ہوگی، اس کا اندازہ، ضمناً، اس سے لگایئے کہ کتنی غیر ملکی زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے! یہ مقامِ فخر نہیں بلکہ مقامِ ندامت ہے، مقامِ عبرت ہے! حیرت ہے ان اصحابِ فکر و نظر پر جو یہ سب کچھ دیکھتے رہے اور خاموش رہے، خصوصاً وہ صاحبِ قلم جو ادب کی صنفِ تنقید میں معروف ہیں!

اگر آج مسلم معاشرہ تنزل اور پستی کی اس حد پر پہنچ گیا ہے، تو اس میں قصور کس کا ہے؟ اس کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے؟ کیا کسی بھی نقطہ نظر سے ہمارے معصیت سے پُر کریہہ افعال، ذلیل اور پست ذہنیت کا ذمہ دار اسلام ہے؟ کیا تاریخ نے ہمیں جو سبق دیے وہ یہی تھے؟ کیا ابتدائے اسلام سے لے کر اس کے زمانۂ عروج تک مسلم معاشرے کی یہی تصویر تھی؟ کیا غربت و افلاس آغازِ اسلام اور اس سے متصل ادوار میں نہیں تھا؛ وہ بھی مسلم معاشرہ تھا اور موجودہ معاشرہ بھی مسلم ہے۔ وہ کیا بنیادی سبب ہے جس کی وجہ سے ماضی کا مسلم "مثالی انسان" تھا اور آج کا مسلم "ننگِ انسانیت" — ! کیا اس کا سبب محض غربت و افلاس ہے جس کو ناول میں مرکزی خیال عطا کیا گیا ہے! کیا صرف معیشت ہی اس کا سبب ہے؟

آپ ناول کے کسی بھی کردار پر نظر ڈالیے، اس مرکزی خیال سے ہٹ کر اس کا خود کوئی وجود نہیں۔ ایک معصوم لڑکا، ایک معصوم عورت، ایک معصوم لڑکی، برائی کو جاتے ہوئے برائی کا شکار ہوتے ہیں۔ کیوں — ؟ صرف اس لیے کہ وہ بے بس تھے، وہ مجبور تھے۔ ان کے لیے فلاح کے تمام راستے مسدود تھے — ! زندہ رہنے کے لیے سوائے اس کے اور کوئی صورت نہ تھی کہ وہ "بدی" کو قبول کرتے! یہی وہ نقطۂ پیکار ہے جہاں سے مختلف مکاتیبِ فکر جنم لیتے ہیں، لیکن مسلم معاشرے میں عکاسی کا یہ انداز اس فکر کی غمازی کرتا ہے جہاں "بدی" کا تصور اور بدی کا وجود ایسے عوامل کا نتیجہ ہے جس میں ایک فرد اپنے وسائل کے بل بوتے پر دوسرے فرد کے حقوق غصب کرتا ہے اور ایسے حالات پیدا کرتا ہے جس میں فریقِ ثانی گرفتار ہو کر اپنی زندگی کو فریقِ اوّل کے ہاتھوں فروخت کر دیتا ہے۔ استحصال کی اس صورت کو عرفِ عام میں سرمایہ داری کا لازمی نتیجہ قرار دیا جاتا ہے۔

ادب کی اس صنف میں حقیقت نگاری کے مختلف طریقے ہیں، بلند ترین وہ ہے جس میں فطرت (NATURE) کی ہو بہو عکاسی کی جائے، لیکن یہ وصف و کمال اکتسابی سے زیادہ قدرت کی ایک دَین ہے اور یہ عام نہیں۔ زیرِ تبصرہ ناول میں جس اسلوب کو اختیار کیا گیا ہے وہ وہی عمومی انداز ہے جس میں ادیب اپنی کسی مخصوص خواہش کی پیروی کرتا ہے۔ خواہش کے تابع لکھی جانے والی یہ عکاسی اس لیے کم تر درجہ کی حامل ہوتی ہے کہ اس میں لکھنے والا اپنی خواہش کی پابندی کرتا ہے اور فطرت (NATURE) کے تقاضوں اور داعیات کو وہاں فراموش کر دیتا ہے۔ جہاں اس کی خواہش ان کے برعکس ہوتی ہے۔

درجہ بندی کے اعتبار سے جب متذکرہ ناول کو دیکھا جائے، تو اس کا شمار اس "واقعہ نگاری" کے تحت ہوگا جہاں ادیب تاثر کا سہارا لے کر عامۃ النّاس کی نفسیات سے کام لیتا ہے اور اس توسط (CHANNEL) سے وہ اپنے مقصد یا پیغام کو معروف کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ یہی وہ پیغام یا مقصد ہوتا ہے جسے "اوّلیت" حاصل ہوتی ہے اور افسانہ، ڈرامہ یا ناول محض ایک ذریعہ (MEDIUM) ہے۔ "تمثیلاً" یوں سمجھیے کہ اگر کوئی ادیب فرائیڈ کے نظریۂ جنسیات (SEX) سے متاثر ہے تو وہ اپنی ادبی تخلیق میں وہی اسباب و علل اور عوامل پیش کرے گا جن سے اس کے خیال کی ترجمانی ہو سکے اور اس کی خواہش کی تسکین ہو سکے!

وہ ادیب جن کی فکر و نظر "آفاقیت" سے مملو ہے، ان آفاقی پہلوؤں کی نمائندگی کرے گا، جو "نظریاتی" عالم سے ماورا ہوں گے۔ زماں و مکاں اور رنگ و نسل سے ماورا یہ تخلیق دائمی (FOR ALL TIME) ہوگی، یہی وجہ ہے کہ وہ تمام ادیب جن میں آفاقیت کا رنگ ہے آج بھی زندہ ہیں۔ اس تفریق اور حد بندی کے بغیر کسی بھی ادبی تخلیق کو پرکھنا ممکن نہیں۔

ہر ادبی تخلیق کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک میکانکی (MECHANICAL) یعنی واقعات کا ایسا تانا بانا (NETWORK) جس میں کردار کے لیے وہ تمام اسباب و علل اور عوامل فراہم کیے جائیں جن سے بساطِ خیال پر وہ صرف ان خانوں میں قدم رکھ سکے جو "بدیہی" ہوں۔ مراد یہ کہ جن عوامل سے اسے دوچار کیا جائے، اس کا عمل ان عوامل کا منطقی ردِعمل یا نتیجہ ہو۔ یہ عمل مشین کے ایک پرزے کی طرح صادر ہوتا ہے۔ کردار وہی کچھ کرتا ہے جو (پسِ پردہ) اس سے کرایا جاتا ہے وہی کہتا ہے، جو اس سے کہلوایا جاتا ہے۔ اسباب و علل کی اس گرفت میں وہ شطرنج کے ایک مہرے کی طرح ہوتا ہے۔ خود اس کی اپنی کوئی شخصیت (PERSONALITY) نہیں ہوتی، جس پر اسے قدرت حاصل ہو۔ نتیجتہً اس کا عمل میکانکی ہو کر رہ جاتا ہے۔

یہ میکانکی گرفت جتنی ڈھیلی ہوگی، اسی نسبت سے اس کردار کی اپنی شخصیت کے نقوش ابھریں گے۔ اور اسی مناسبت سے وہ واقعات کا مقابلہ کرنے میں آزاد ہوگا۔ ایک مثال سے شاید میرا مفہوم زیادہ واضح ہو جائے۔ یکساں حالات فراہم ہونے کے باوجود ہر انسان ان سے وہی اثر لے گا، جو اس کے مزاج یا افتادِ طبع کے مطابق ہو۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر انسان پر یکساں حالات کا یکساں اثر ہو۔ عمل وہ پیمانہ ہے جس سے ایک حد تک اثر کی نوعیت اور شدّت کا پتہ چلتا ہے۔ "الف" اگر "ب" کو مارے، تو یہ لازم نہیں کہ "ب" پر جو ردِعمل ہوگا، وہ اپنے اثر اور شدت کے اعتبار سے اتنا ہی ہوگا جو "ج" پر ہو۔ ایک ہی گھر میں، ایک ہی واقعے کا اثر، گھر کے مختلف افراد پر مختلف ہوتا ہے۔ باپ کی موت ایک بچے کے لیے زیادہ جان کاہ ثابت ہوتی ہے، لیکن دوسرے کے لیے نسبتاً کم، باپ کی موت کے بعد، احساسِ ذمہ داری کسی پر زیادہ اور کسی پر کم۔ اسی طرح اچھائی یا برائی ہے۔ کسی فرد کی طبعیت پر اچھائی یا برائی کا اثر بھی اس کے مزاج اور افتادِ طبع پر منحصر ہے۔

سطورِ بالا میں جو پہلو پیش کیا گیا ہے وہ "فطری" یا غیر میکانکی (NON-MECHANICAL) ہے یہ ادبی تخلیق کا دوسرا پہلو ہے۔

ان دونوں پہلوؤں میں جتنا توازن اور ہم آہنگی ہوگی، وہ تخلیق بھی اسی قدر کامیاب ہوگی۔ قارئین ناظرین ان دونوں پہلوؤں کو سامنے رکھیں اور جائزہ لیں کہ زیرِ تبصرہ ناول میں کون سا پہلو غالب ہے۔ یہ کہنا غالباً بے جا نہیں ہوگا کہ ہر کردار کے "عمل" یا "فعل" کی یکسانیت اتنی غالب ہے کہ ان کی افتادِ طبع اور ان کی فطرت اس میکانکی پہلو نے اوجھل کر دی ہے — یہ کیوں؟ جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں، جہاں ادیب "مقصدیت" کو اوّل گردانتا ہے، وہاں عوامل کا تانا بانا فطری تقاضوں کو ابھرنے نہیں دیتا

یہ عدمِ توازن ہر اس تحریر میں نظر آئے گا جہاں "انسان" کو ناقص اور فرسودہ مادے (MATTER) کی "حادثاتی پیداوار" (COMING INTO BEING THROUGH AN ACCIDENT) سمجھا جائے۔

جہاں انسان کی اشرفیت (NOBILITY) کی تعریف اور تصوّر مادے سے ماورا کوئی حقیقت نہ رکھتی ہو، وہاں "احسن تقویم" کا تصوّر محال ہے۔ مادے کو اساس بنا کر جب "انسان" کا کھوج یا سراغ لگانے کی کوشش کی جائے، تو کیا ہاتھ آئے گا؟ یہ پانے والے کی "قسمت" پر ہے۔ تین گرانمایہ خزانوں میں سے کوئی ایک تو ضرور مِل جائے گا۔ وہ خزانے یہ ہیں۔ (ا) جنسیات (SEX) (ii) فسونِ سرمایہ (iii) فریبِ اشتراکیت! اسے یوں سمجھیے کہ ایک پیکرِ جنسیات جسے سرمایہ کی فسوں کاری نے اشتراکیت کا رنگ دے دیا ہے۔

* *

آیئے! ایک نگاہِ غلط انداز اس "پیکر" پر بھی سہی!

جیساکہ گذشتہ سطور میں ظاہر کر چکا ہوں، متذکرہ ناول قطعاً "مادی" بنیادوں پر مشتمل ہے اور جو تاثر لیا گیا ہے، وہ یہ کہ عمل کی جواب دہی کے سلسلے میں مادے سے ماورا کچھ نہیں! اس سلسلے میں وہ کردار جو "بیدار" رہے اور جب تک بیدار رہے۔ "بدی" کو "بدی" اس اصول پر سمجھتے رہے کہ انہیں مرنے کے بعد جواب دینا ہے! یہ صرف "خشیّتِ الٰہی" کا جذبہ ہے جو زندگی میں بھی کسی مذموم فعل کے ارتکاب سے انسان کو روکتا ہے۔ جوں جوں "جواب دہی" کا یہ احساس کم ہوگا، انسان کسی بھی جرم کے ارتکاب میں اسی قدر آزاد ہوگا! ناول کے وہ کردار جو اس حقیقت سے ابتدًا باخبر تھے، رفتہ رفتہ اس سے "بے نیاز" ہو جاتے ہیں، اور اگر انہیں کوئی خوف ہوتا ہے، تو وہ "دنیاوی سزا" ——— CRIME 8 PUNISHMENT تک محدود! خوف کا یہ تصوّر اور خوف کا وہ تصوّر، جس میں مجرم یہ سمجھتا ہے کہ "کوئی اسے دیکھ رہا ہے ——— کوئی اس کی رگِ جاں سے بھی قریب ہے اور وہ اس کے تمام عزائم اور اندیشوں سے باخبر ہے" ——— بالکل مختلف ہے! مصنّف جس خوف کا اپنے کردار کو شکار بناتا ہے وہ پہلی قسم کا "دنیاوی" خوف ہے! اور خدا کے سامنے جواب دہی کے خوف کو خارج کر دیتا ہے ——— "خدا کی بستی" میں خدا کے سامنے جواب دہی کے بجائے صرف انسان کے سامنے جواب دہی کس حد تک درست ہے؟ کیا اس عنوان کا یہ تقاضا نہیں تھا کہ کم از کم ہر اس کردار کو، جو "بدی" کو اِس معنی میں بدی سمجھتا ہے

اتنی فطری آزادی تو دی ہوتی کہ وہ اس کا اظہار کر سکتا۔؟

ناول کے "میکانکی" کردار جس اخلاق کا نمونہ پیش کرتے ہیں وہ اُسی "مقصد" کے تابع ہے، جس کے تحت یہ "ذخیرہ" لکھا گیا۔ باہمی اخلاق، لین دین، تعلقات، دوستی اور دشمنی جس طور پر گردش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، وہ "خود غرضی" ہے، بنائے بُرایں، ذاتی مفاد تک، اختصار کو عمل ہے اور اس کے بعد ہر شخص ایک اجنبی!

موجودہ معاشرے کی یہ "اکائی" جس مادّی بساط پر تھرکتی دکھائی گئی ہے، وہ ان خانوں سے مزیّن ہے، جن میں "معاشی" رنگ بھرا ہوا ہے۔ کالے مہرے کو سفید گھر میں جانے کا حق نہیں! جب معاش و معیشت کو بساطِ حیات کا فرمانروا سمجھ لیا جائے، تو جو کردار وجود میں آئیں گے وہ وہی ہیں جن کی نمائش ہم نے اس سلسلے میں ٹی وی پر دیکھی! ذرا خود انصاف کیجیے، اس بندش میں جکڑے لینے کے بعد کسی کردار میں بہتر فکر و نظر، صالح اعمال و اخلاق کہاں سے آ سکتے ہیں؟ اس کا تو خمیر ہی "معاشی" بنا دیا گیا ہے اور وہ محض ایک معاشی اکائی ہے! پھر ستم ظریفی یہ کہ "مسلم" معاشرے کی نمائندگی ہے! کیا مسلم معاشرے کی بساطِ حیات "معاشیات" ہے۔؟ ظاہر ہے، اس سے ملتِ اسلامیہ کی وحدانیت قائم نہیں رہ سکتی! اس سے جس چیز کی پرورش ہوگی اور تقویت پہنچے گی، وہ عدمِ اعتماد، خود غرضی اور طبقاتی منافرت اور کش مکش ہے۔ اس کے سوا کسی اصلاحی یا فلاحی مقصد کا حصول ممکن نہیں ——— !

یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ "اخلاق" "معاشیات" کی "پیداوار" نہیں! اخلاقی اقدار کے تعیّن میں معیشت کو کوئی دخل نہیں ——— اور ——— میری مُراد اس اخلاق سے ہے، جس کی تعلیم اسلام دیتا ہے ——— میں اس حد بندی پر اس لیے مجبور ہوں کہ زیرِ نظر تبصرہ ایک ایسی کتاب پر ہے جو خدا ہی کو بنیاد قرار دے کر آگے بڑھتی ہے ——— ابتدائے اسلام میں مسلمانوں کی معیشت کی حالت کسی سے چھُپی ہوئی نہیں۔ نہ تن پر صحیح کپڑے تھے اور نہ پیٹ بھر کر کھانا میسّر تھا ——— اور دشمنانِ اسلام کے مظالم اس پر سِوا ——— ! ایک مٹھی بھر جماعت جس کردار، جس اخلاق اور جس عالی ظرفی کا ثبوت دیتی ہے اسے دہرانے کی ضرورت نہیں!

آج ہم دار السلام میں ہیں۔ موجودہ حالات اور زمانۂ آغازِ اسلام کا موازنہ کر کے دیکھیں اور خود اپنی ذات سے انصاف کریں کہ آج ہم کیا بن گئے ہیں؟ اور کیا معاشی عدل کا حصول "بدی" کی عکاسی میں اس وقت ممکن ہے جب کہ "بدی" کا تصوّر ہی سرے سے بدل گیا ہو! جب

بساط کا مُہرہ ہی "بدی کا پتلا" ہو تو کسے یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ کسی دوسرے کی گرفت کرے! اس منزل پر طنز و تمسخر بھی لایعنی ہیں!

اگر بدی کی عکاسی محض برائے عکاسی ہے، تو کوئی صاحبِ فہم اسے صحت مند اقدام نہیں کہہ سکتا! اور پھر وہ بھی طنز و تمسخر کا ایسا "روپ" دے کر سامنے آئے کہ معصوم عوام اس کا شکار ہو جائیں! دیانتداری کا تقاضا یہ ہے کہ جب ادیب کسی واقعہ کی "عکاسی" کرے، تو اس کی "علّت" کو وہی مقام دے، جس جگہ وہ واقعتاً ہے اور اس سے جو نتائج پیدا ہوں وہ فطری (NATURAL) ہوں۔ میکانکی (MECHANICAL) نہیں، مزید براں، کسی علّت کو حقیقت (TRUTH) کا رنگ دینا یا اس معنی یا اس پس منظر میں بھی پیش کرنا دیانت داری کے خلاف ہوگا۔ اس علّت کو "امکانی صورت ——— " PROBABILITY سے زیادہ اہمیت دینا، اپنی پوری تخلیق کو ناکارہ بنا دینا ہے؟

قبل اس کے کہ اس تبصرہ کو ختم کروں، یہ مناسب ہوگا کہ ادبی جائزے LITERARY CRITICISM سے جو نتائج برآمد ہوئے ہیں، انہیں ترتیب وار درج کروں:۔

الف :۔ ناول کا نام یا تو بے معنی ہے یا گمراہ کُن

ب :۔ ناول کا خاکہ کسی مخصوص "مقصد" کی غمازی کرتا ہے۔

ج :۔ کردار "میکانکی" ہیں۔ ان کی فطرت کو ابھرنے کا موقعہ نہیں دیا گیا ہے۔

د :۔ واقعات کی صحیح عکاسی کی غایت سوائے اس کے کچھ نہیں کہ صرف غربت و افلاس کو تمام برائیوں کی جڑ یا بنیاد قرار دیا جائے، حالانکہ یہ محض ایک "دعویٰ" ہے، لیکن، موجودہ معاشرے کی برائیوں کو بنیاد قرار دے کر، اسے حقیقت کا رنگ دیا گیا ہے ——— یہ طریقہ صحیح نہیں، اس لیے کہ یہ "گمراہ کُن" ہے ———

ہ :۔ "معیشت" کی بساط پر سارا کھیل کھیلا گیا ہے، حالانکہ "معیشت" ایک جزو (پہلو) ہے "کُل" نہیں۔

و :۔ ایسا کوئی واقعہ یا کردار پیش نہیں کیا گیا، جس سے اس احساس کو تقویت پہنچے کہ "خدا کی بستی" سے احیائے ملّتِ اسلامیہ مقصود ہے! بلکہ جو کچھ پیش کیا گیا ہے، وہ اسلامی اقدار پر بھرپور طنز ہے۔ جس کی شہادت خود کتاب کے نام سے عیاں ہے!

ایک شہری

ایک "پراسرار واردات" ــــ مگر یہ آغاز تو نہیں

اخبارات میں پچھلے دنوں یہ پریشان کن خبر شائع ہوئی کہ ماڈل ٹاؤن کے ایک معزز شہری اور ڈویژنل کونسل کے رکن راناصفدر جنگ کو پراسرار طور پر اغوا کر لیا گیا۔ راناصفدر جنگ ۲۶ گھنٹے کی غیر حاضری کے بعد گھر پہنچ گئے۔ انہوں نے اخبارات کو اپنے اغوا کی سنگین واردات کی تفصیلات سے آگاہ کیا۔ اغواء کی اس "پراسرار واردات" پر ۱۳ اکتوبر کو روزنامہ امروز کے فاضل ایڈیٹر نے بڑا ہی دردمندانہ اور اثر انگیز اداریہ تحریر کیا وہ لکھتے ہیں: "اس واقعے کا اطمینان بخش پہلو صرف یہ ہے کہ ان کی جان بچ گئی اور وہ اپنے مضطرب، ہراساں، اور دل گرفتہ خاندان سے آملے۔ خدانخواستہ ان کی جان پر بن جاتی تو اغواء کی اس المناک واردات کی سنگینی کہیں زیادہ بڑھ جاتی۔" اس واردات کے پس منظر میں فاضل مدیر نے معاشرے کے ایک سنگین مسئلے کی نشان دہی کی ہے "ــــ سوال یہ ہے کہ اس بھری پُری بستی میں جہاں کے باسیوں کو اپنی دردمندی، انسان دوستی اور اجتماعی شعور پر غرّہ ہے کیا کسی انسان کی زندگی، عزت اور مال پر کسی وقت بھی ڈاکہ ڈالا جا سکتا ہے؟۔ کیا ہم ایک دوسرے سے اتنے لاتعلق ہو گئے ہیں کہ کسی پر قیامت بھی گذر جائے، تو ہمیں کوئی ملال نہیں ہوتا؟ ــــ"

بلاشبہ ہمارے معاشرے کا یہ انتہائی سنگین مسئلہ ہے، لیکن راناصفدر جنگ کا اغواء اس کا پہلا مظاہرہ نہیں۔ اسی شہر میں نہ جانے ایسے کتنے واقعات ہو چکے ہیں۔ غالباً ستمبر یا اکتوبر ۱۹۶۳ء کی بات ہے مال روڈ پر لوگوں کا ہجوم تھا۔ ایک سائیکل سوار ایک بیگم صاحبہ کی تیز رفتار اور غلط سمت میں جاتی ہوئی کار کی زد میں آ کر جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ حادثے کے روح فرسا آثار کے اردگرد کھڑے ہوئے لوگ کہہ رہے تھے: دولت کے نشے میں یہ امیر لوگ اندھے ہو چکے ہیں۔ کوئی کہہ رہا تھا بیگم صاحبہ "رانگ سائڈ" آ رہی تھیں۔ کسی نے لقمہ دیا: ٹریفک کا اشارہ توڑ کر ان کی کار چوراہے سے گزری تھی۔ کچھ لوگ بتا رہے تھے کہ کس طرح غریب سائیکل سوار کا سر تن سے جدا ہو گیا۔ غضب کا ایکسیڈنٹ تھا، پچاس ساٹھ میل کی رفتار سے چلتی ہوئی کار بیگم صاحبہ کے قابو سے باہر ہو گئی تھی۔ اخبارات اس وقت بھی اس شہر میں شائع ہوتے تھے۔ صبح کو کسی اخبار میں اس واقعے کی خبر تک نظر سے نہ گزری۔ حادثے کو دیکھنے والے سینکڑوں افراد کے لیے یہ کتنی حیران کن بات ہوگی کہ اتنا سنگین حادثہ ہوا، لیکن اخبار والوں کو اس کی اطلاع ہی نہ مل سکی۔ ایک اخباربین نے کہا اجی اخبار والوں کو چھوڑیے یہ تو بس اپنے مطلب کی خبریں شائع کرتے ہیں۔ لیکن عوام کی سب باتیں بھی تو قابلِ اعتبار نہیں ہوتیں۔ کسی حادثے کا ذکر کرتے ہوئے لوگ رنگ آمیزی اور مبالغہ آرائی سے بھی تو کام لیتے ہیں اور ان کی مبالغہ آرائی کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ ایسے کسی واقعے کے بارے میں اگر حقائق سامنے نہ آئیں، تو پھر وہ ذمہ دار شہریوں کی طرح آگے بڑھ کر اصل بات کو سامنے نہیں لاتے۔

دو روز بعد اخبارات میں خبر شائع ہوئی کہ مال روڈ پر ایک سائیکل سوار کار کی زد میں آ کر زخمی ہو گیا تھا، جسے غریبوں کے ہمدرد، امیر کبیر خاندان کے ایک چشم و چراغ (جو قومی اسمبلی کے ممبر بھی تھے)، کی اہلیہ چلا رہی تھیں۔ زخمی کو کار میں ہسپتال پہنچایا گیا جہاں فوری طبی امداد پہنچانے اور خون دیے جانے کے باوجود اس کی جان نہ بچائی جا سکی۔ اب ظاہر ہے اخبارات تو اتنی اہم شخصیت کے معاملے میں غیر ذمہ داری سے خبر شائع نہیں کر سکتے تھے۔ ایک معمولی سائیکل سوار کی موت کی خبر اگر ایک روز شائع نہ ہوتی، تو اس سے کوئی فرق نہ پڑتا، لیکن ایک باعزت شہری کے بارے میں اگر کوئی غلط بات محض جلد بازی کی وجہ سے شائع ہو جائے، تو ازالہ حیثیتِ عرفی کے مقدمہ کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔

* *

انسان دوستی اور اجتماعی شعور پر ناز کرنے والے شہریوں کی جس بے حسی کی طرف ایڈیٹر امروز نے اشارہ کیا ہے اس کی بہت سی مثالیں آئے دن سامنے آتی رہتی ہیں۔ کوئی تین سال پہلے کی بات ہے کینال بنک کی ایک کوٹھی میں ایک نوجوان گھریلو ملازمہ پستول کی گولی لگنے سے ہلاک ہو گئی۔ محلے کے لوگ اس پراسرار واردات کے متعلق طرح طرح کی باتیں بناتے رہے، ظاہر ہے لوگوں نے اس معاملے میں ایسے ایسے قیاس کے گھوڑے دوڑائے ہوں گے کہ اخبار والے پریشان ہو گئے اور انہوں نے یہی سمجھا کہ بس اس خبر کو گول کر جاؤ۔ آخر میں بات، تو پولیس کی تحقیق کے مطابق صرف اتنی نکلی کہ سادہ لوح ملازمہ صاحب کے ملبوسات کی الماری سے ان کے کپڑے نکال رہی تھی۔ اس کی نظر دراز میں رکھے ہوئے پستول پر پڑی۔ نادان تھی، اسے کھلونا سمجھ کر لگی الٹ پلٹ کر دیکھنے، قضائے الٰہی سے انگلی پستول کی لبلبی پر جا پڑی۔ پستول بھرا ہوا تھا، ایک گولی موت کا پیغام بن کر پستول کی نالی سے نکلی اور اس ناسمجھ لڑکی کے جسم میں پیوست ہو گئی۔ موت برحق ہے اور جب پیغامِ اجل آتا ہے، تو کوئی اس کی تعمیل سے انکار نہیں کر سکتا۔ کوئی اپنے ہاتھ سے دانستہ یا نادانستہ روانگی کا انتظام کرتا ہے کسی کو اغواء یا قتل کرنے والے کے ظالم ہاتھ اس جہانِ فانی سے رخصت کرتے ہیں، ورنہ انسان مرض کی حالت میں اپنے گھر یا ہسپتال کے بستر پر جان دیتا ہے بڑے بڑے معالج بستر کے گرد کھڑے رہ جاتے ہیں۔

دور کیوں جائیے حاجی اسحاق حنیف کی المناک اور پراسرار موت ہی اس شہر کے لوگوں میں اجتماعی شعور کے فقدان کی تازہ مثال ہے۔ رات بھر ان کی لاش ایک کار میں لارنس روڈ پر، باغِ جناح کے کنارے پڑی رہی۔ اس سڑک پر رات بھر کاروں کی آمد و رفت جاری رہتی ہے لیکن صبح چھ بجے تک کسی نے سڑک کے کنارے کھڑی ہوئی کار اور اس میں پڑی ہوئی لاش پر توجہ نہ دی۔ فرض کیجیے اس کار میں لاش کے بجائے کوئی ایسا مریض پڑا ہوتا جسے طبی امداد کی ضرورت تھی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر اس شہر کی سڑکوں پر کوئی جاں بلب انسان پانی

کی ایک بوند، دوا کے ایک قطرے یا ہمدردی کے ایک لفظ کے لیے رات بھر پڑا رہے، تو کوئی اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔ کوئی راہ گیر رُک کر یہ نہیں پوچھے گا کہ تمہیں کسی امداد کی ضرورت تو نہیں۔

بات یہاں ختم نہیں ہو جاتی جب انتظامیہ نے حاجی اسحاق حنیف کی پراسرار موت کی عدالتی تحقیقات کا اعلان کیا، تو لوگ تحقیقاتی مجسٹریٹ کے پاس بیان دینے کے لیے نہیں پہنچے۔ بعض لوگ اخبارات کے نام گمنام خطوط بھیجتے رہے۔ اخبارات نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ تحقیقاتی مجسٹریٹ یا پولیس افسروں کے پاس جا کر بیان دیں، لیکن کسی خط لکھنے والے نے اس کی ضرورت محسوس نہ کی۔ امروز کے فاضل مدیر نے درست کہا ہے کہ "کیا ہم ایک دوسرے سے اتنے لاتعلق ہو گئے ہیں کہ کسی پر قیامت گزر جائے، تو ہمیں کوئی ملال نہیں ہوتا؟ کوئی بھی ہوش مند اور باشعور شخص اس صورتِ حال کو دائمی اور ناگزیر سمجھنے اور قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہو سکتا۔ ممکن ہے بعض لوگوں کے نزدیک اس نوع کی اکا دکا وارداتیں کچھ گمراہ اور بدباطن افراد کی مجرمانہ ذہنیت اور ایذا پسندی کا مظہر ہوں؛ تاہم ان کا وقوع پذیر ہونا ہی اس بات کی علامت ہے کہ ہمارے معاشرے میں منفی رجحانات فروغ پذیر ہیں اور اگر ان کے سدِّ باب کے لیے جرأت مندانہ اور فیصلہ کن اقدامات نہ کیے گئے، تو آگے چل کر وہ خدشات جو ابھی احساس کی حد تک ہیں، بڑی ہی بھیانک حقیقت کا روپ دھارنے لگیں گے —"

معاشرے میں بدعنوانی، بدانتظامی، فریب کاری، جرائم اور ناپسندیدہ حرکات کی روک تھام کے لیے جہاد کرنا صرف اخبارات کی ذمہ داری نہیں ہے۔ اخبارات کے متعلق تو بعض دانشوروں کی رائے یہ بھی ہے :

"آج کل کے اخبارات تو نکلتے ہی حقائق کو چھپانے اور ان پر پردہ ڈالنے کے لیے ہیں" (نیوز پیپر اینڈ سوسائٹی صفحہ ۸۱) کولمبیا سکول آف جرنلزم کے مسٹر کارل ڈبلیو ایکرسن کے ایک جائزے کے مطابق اخبارات کے متعلق معاشرے کے بعض ممتاز افراد کی آراء میں سے یہ بھی ایک رائے ہے) گذشتہ سال ہی انٹرنیشنل پریس انسٹیٹوٹ نے دنیا بھر کے اخبارات کے متعلق اپنے جائزے میں یہ رائے ظاہر کی ہے کہ عام طور پر اخبارات پر سے قارئین کا اعتماد اٹھتا جا رہا ہے اور لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اخبارات اپنے ناشرین کے مفادات اور اغراض کے مطابق خبروں کو توڑ مروڑ کر شائع کرتے ہیں، بعض واقعات کو مسخ کر کے آدھا سچ اور آدھا جھوٹ پیش کرتے ہیں اور ضرورت پڑے، تو بے بنیاد خبریں گھڑ کر شائع کر دیتے ہیں۔ اگر دنیا بھر کے اخبارات کے متعلق قارئین کی یہ رائے ہے، تو ظاہر ہے پاکستان کے اخبارات بھی اس سے مستثنیٰ نہیں رہ سکتے۔ اس کے باوجود بھی اخبارات معاشرے کی بڑی خدمت انجام دیتے ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ موجودہ معاشرے میں اخبارات ہی وہ طاقت ہیں جن سے بدکردار، بے ایمان، بددیانت اور بدعنوان لوگ سب سے زیادہ خوف کھاتے ہیں۔

اخبارات سے اخبارات تک

اخبار بین

روزنامہ "ندائے ملت" لاہور نے ۱۸ اکتوبر ۶۹ء کو اپنے اداریے میں "سیاسی جماعتوں پر غیر ملکی امداد کا الزام" کے زیرِ عنوان بڑے اہم سوالات اٹھائے ہیں۔ اگر جگہ ہوتی، تو ہم اسے پورے کا پورا نقل کرتے، تاہم اس کے بعض اہم حصے حسبِ ذیل ہیں :

"ہم مارشل لا حکام سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ ایک سپیشل ٹریبونل کے ذریعے پبلک طور پر تحقیقات کریں کہ اس ملک میں کس کس سیاسی لیڈر، کون کون سی سیاسی جماعت، اخبار اور اشاعتی ادارے نے کس کس طریق سے براہِ راست یا بالواسطہ غیر ممالک کی (جن میں پاکستان کے دشمن ملک بھی شامل ہیں) ایجنٹی کی اور مالی امداد وصول کی، ایجنٹی کر رہے ہیں اور غیر ملکی امداد وصول کر رہے ہیں یا دلالی کے فرائض سر انجام دے رہے ہیں۔ کون کون سے سیاسی لیڈروں، اشاعتی اداروں یا اخباروں نے سستے نیوز پرنٹ اور درآمدی کوٹے کی دلالی سے اپنے منہ سیاہ کیے۔ کون کون سے اشاعتی ادارے آج بھی اشتراکی ملکوں سے اونے پونے داموں کتابیں درآمد کر کے لاکھوں روپے بنا رہے ہیں۔ حکومت کا اوّلین فرض ہے کہ وہ ایسی کالی بھیڑوں کو بے نقاب کرے اور مجرموں کو کٹہرے میں کھڑا کرے، تاکہ عوام کو معلوم ہو سکے کہ انہیں روٹی کپڑے کا سراب دکھانے والے کس طرح لکھ پتی بنتے ہیں اور بنتے جا رہے ہیں۔ گذشتہ سال کے آخر میں سابق صدر محمد ایوب خاں کے خلاف عظیم عوامی تحریک کے زمانے میں نوجوانوں میں درجنوں مفت سکوٹر تقسیم کرنے کا سکینڈل بھی عام لوگوں کی زبان پر تھا۔ حکومت کو لگے ہاتھوں اس سیاسی رشوت کے غیر ملکی سرچشموں کا بھی پتہ لگانا چاہیئے۔" "ندائے ملت" کے اس مطالبے کو فوراً پذیرائی بخشنی چاہیے، تاکہ معلوم ہو سکے کہ جن لوگوں کی زبانیں دوسروں پر لعن طعن کرنے کے معاملے میں نو نو گز کی ہو گئی ہیں۔ دراصل ان کی حقیقت کیا ہے؟ اگر "اشتراکی صحافیتے" اپنا دامن صاف رکھتے ہیں، تو انہیں بھی اس مطالبے کی تائید کرنی چاہیے۔

*

روزنامہ "جنگ" کراچی میں اشتراکیت اور اس کے محرکات و مضمرات پر جناب پیر علی محمد راشدی نے دو قسطوں میں (جو ۱۳ اور ۲۰ اکتوبر کے شماروں میں شائع ہوئیں) تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ پیر صاحب نے بڑے مدلل انداز میں اشتراکیت کا جائزہ لیا ہے اور آخر میں تحریر فرمایا ہے :

(۱) "ہم کو یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ پاکستان اور اسلام کے لیے سوشلزم مفید ہے یا مضر۔

(۲) اگر مضر ہے، تو اس کو فوراً خلافِ قانون قرار دے دینا چاہیے جس طرح کمیونزم ہمارے یہاں خلافِ قانون ہے۔" یاد رہے اس سے پہلے پیر صاحب نے تفصیلی بحث فرما کر اشتراکیت کو قومی نقطۂ نظر سے مضر قرار دیا ہے۔ ہمیں آج جو مسائل درپیش ہیں۔ اُن پر علمی انداز میں گفتگو کر کے قارئین کی تربیت کرنا اخبارات کا قومی فریضہ ہے۔

روزنامہ "جنگ" کراچی نے ایک اہم مسئلے پر بہت مدلل مضمون شائع کر کے یقیناً یہ فریضہ اچھی طرح انجام دیا ہے — لیکن "باغباں بھی خوش رہے راضی رہے صیاد بھی" کے مصداق ۲۰ اکتوبر ہی کی اشاعت میں ادارتی صفحے پر ایک نامور صاحب قلم کی "دخل در معقولات" درج ہے، جس میں اشتراکیت کو محض اقتصادی نظام

قرار دے کر اس کی تبلیغ فرمائی گئی ہے۔

*

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے ۱۴ اکتوبر کو کراچی میں جماعت اسلامی کے کارکنوں کے ایک اجتماع میں سوالوں کے جواب دیئے۔ اس کی کارروائی کراچی کے تقریباً تمام اردو اخبارات نے اپنی ۱۶ اکتوبر کی اشاعت میں (کراچی میں اخبارات اپنی اشاعت سے ایک دن آگے کی تاریخ درج کرتے ہیں) تفصیل سے شائع کی۔ مولانا سے ایک سوال پوچھا گیا: "کیا سوشلسٹ مرد سے مسلمان عورت کا نکاح ہو سکتا ہے؟" مولانا مودودی نے جواب دیتے ہوئے جو کچھ کہا، اُسے روزنامہ جنگ کے سٹاف رپورٹر کی زبانی سنیے "اگر کوئی شخص صاف صاف کہے کہ وہ خدا، رسول اور قرآن کو نہیں مانتا، آخرت پر یقین نہیں رکھتا اور اعلانیہ ان سب کا مذاق اڑاتا ہے، تو اس کے بارے میں باقاعدہ شہادت پیش کر کے اُس کی مسلمان بیوی خلع کرانے کا حق رکھتی ہے۔ جن لوگوں کے متعلق یہ باتیں صاف صاف معلوم ہوں۔ اُن سے شادی بیاہ جائز نہیں۔ انہوں نے مزید کہا کہ کسی کو محض سوشلسٹ کہہ دینے سے آپ یہ فائدہ نہیں اٹھا سکتے کہ اس سے نکاح ناجائز ہے لیکن ہے وہ محض فیشن کی بنا پر سوشلسٹ ہو۔" ایک سوال غیر ممالک کی امداد لینے کے الزام کے بارے میں کیا گیا۔ اس کا جواب بھی "جنگ" کراچی کے سٹاف رپورٹر کی زبانی ہی سنیے۔ "ہمارے ہاں ایک ایک پیسے کی آمدنی کا حساب رکھا جاتا ہے۔ جماعت کے کارکن متفقین اور ہمدرد اپنی جیب سے روپیہ نکالتے اور خرچ کرتے ہیں۔ نتیجہ ہے کہ دوسرے جو کام ایک لاکھ روپے میں کرتے ہیں ہم ۵ ہزار میں کر لیتے ہیں۔ ہمارا رہنا سہنا سب کے سامنے ہے۔ دُنیا جانتی ہے کہ کوٹھیاں، جائیدادیں اور بڑی بڑی کاریں کس کے پاس ہیں۔" "مشرق" کراچی میں بھی مولانا مودودی کے یہی جوابات شائع ہوئے، لیکن "امروز" ملتان نے اس کا جو حلیہ بگاڑا ہے وہ ملاحظہ ہو۔ ۱۶ اکتوبر کی اشاعت میں یہ اخبار لکھتا ہے:

"مولانا مودودی نے کہا ہے کہ سوشلسٹوں کے ساتھ مسلمان عورت کا نکاح ناجائز ہے۔ اگر کسی عورت کا شوہر ایسا ہے، تو اسے عدالت کے ذریعے طلاق حاصل کر لینا چاہیے، لیکن جو لوگ محض فیشن کے طور پر سوشلسٹ ہیں۔ وہ فی الحال کافر نہیں ہوئے۔"

بیرونی امداد کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے۔ "مولانا مودودی نے کہا ہمیں عدالت میں جانے کی ضرورت نہیں، ہمیں جہاں جہاں سے روپیہ ملتا ہے، ہم اس کا پورا حساب رکھتے ہیں۔ ہمیں عدالت میں جا کر اپنی ہی تذلیل کرنے کی کیا ضرورت ہے۔"

دیکھیے دونوں اخبارات کی رپورٹنگ میں کیا زمین آسمان کا فرق ہے اور پھر یہ کہ ایک طرف دو اخبارات یک زبان ہیں ——— دوسری طرف "امروز" ملتان ——— اس نے یہ خبر کسی ایجنسی یا رپورٹر کے حوالے کے بغیر دی ہے۔ کیا عزیز احمد صاحب کو اب بھی یہ پوچھنے کی ضرورت ہے کہ ٹرسٹ کے اخباروں میں مخالفین کی خبروں پر کیا گزرتی ہے؟

*

روزنامہ "امروز" لاہور مورخہ ۱۹ اکتوبر ۱۹۶۹ء کی ایک خبر ملاحظہ فرمائیے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

"جماعت اسلامی والوں کو اخباروں کی فکر

——— امروز کے نامہ نگار سے

شیخوپورہ ۱۹ اکتوبر سوشلسٹ عناصر کا مقابلہ کرنے کے لیے پریس پر مکمل قبضہ کرنا ضروری ہے۔ اس خیال کا اظہار جماعت اسلامی کے اراکین نے انجمن شہریان لاہور کے سیکرٹری رانا نذرالرحمٰن کے اعزاز میں دیے گئے استقبالیہ میں بات چیت کے دوران کیا۔"

غور فرمائیے اس بات چیت کے دوران کا کوئی جواب ہے کیا؟

عمر کوٹ ضلع تھرپارکر سے ابن محی الدین صاحب نے تحریر فرمایا ہے:

"پچھلے دنوں حیدر آباد میں سندھ مہاجر کنونشن منعقد ہوا۔ دو روزہ اجلاس میں سندھ کے اطراف واکناف سے کئی سو مندوبین شریک ہوئے۔ مقامی سندھی اخبارات نے محض تعصب کی بنا پر اس کنونشن کی خبروں کا بائیکاٹ کیا۔ اس کے برعکس فرضی اور من گھڑت اختلافی خبریں سندھی اخبارات میں شائع ہوتی رہیں۔ صرف روزنامہ "حریت" کراچی نے کنونشن کی مکمل روئیداد شائع کی۔ روزنامہ "جنگ" نے پہلے تو کنونشن کی خبروں کا بائیکاٹ کیا اور جب کنونشن بخیر و خوبی اختتام پذیر ہوا تو دوسرے دن پہلے صفحہ پر جناب ظہیر الحسنین لاری (کونسل مسلم لیگ) کا اختلافی بیان شائع کر دیا گیا جس میں وحدت کی قرارداد سے لاتعلقی کا اظہار کیا گیا تھا۔ جسٹس لاری صاحب نے قرارداد کا مطالعہ کئے بغیر لاتعلقی کا اظہار فرما دیا۔ حالانکہ قرارداد میں وحدت مغربی پاکستان سے متعلق یہ الفاظ درج تھے کہ منتخبہ ارکان اس کا فیصلہ کریں کہ آیا ون یونٹ مفید رہے گا یا نہیں۔ صرف چند سیاستدانوں کے بیانات کو قوم کی آواز نہیں کہا جا سکتا۔ بہرحال یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ دراصل "جنگ" کے رویے کی طرف توجہ دلانا مقصد تھا۔ آپ ہی بتائیں کیا اسی کا نام صحافت ہے؟"

*

راولپنڈی سے امتنان قریشی صاحب نے ہمیں "جنگ" راولپنڈی کا ایک تراشہ بھیجا ہے جس میں عبدالمالک مرحوم کے والد عبدالواحد کا بیان چھپا ہے۔ جبکہ عبدالواحد صاحب کو دنیا سے رخصت ہوئے کئی برس بیت چکے ہیں۔ ہم ذیل میں اس خبر کا عکس چھاپ رہے ہیں تاکہ ہمارے قارئین اسے ملاحظہ فرمائیں اور "جنگ" راولپنڈی کی باخبری کی داد دیں۔

مالک کا قتل نظریاتی اختلافات کا نتیجہ نہیں

مقتول کے والد عبدالواحد کا بیان

طلباء کی طرف سے قتل کی عدالتی تحقیقات کا مطالبہ

راولپنڈی ۱۶ اکتوبر (اسٹاف رپورٹر) دارالحکومت کے طلباء کی ایک تنظیم لبرل اسٹوڈنٹس یونین نے راولپنڈی کے ایک طالب علم عبدالمالک کے قتل کو سیاسی رنگ دینے کی کوششوں کو قابل مذمت قرار دیا ہے یونین نے عوام سے اور بالخصوص طالب علموں سے اپیل کی ہے کہ وہ ان لوگوں سے ہوشیار رہیں جو مبینہ طور پر ملک میں انتشار پھیلا کر اور عوامی جذبات مشتعل کر کے اپنے سیاسی کاروبار کو چمکانا چاہتے ہیں یونین کے ایک ہنگامی اجلاس میں ایک قرارداد منظور کی گئی ہے جس میں عبدالمالک کے قتل کی عدالتی تحقیقات فوراً شروع کرنے کا مطالبہ کیا گیا ہے تاکہ قتل کے اصل محرکات سامنے آ سکیں مانسہرہ میں نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن میں طلباء میں تشدد کے بڑھتے ہوئے رجحانات کی شدید مذمت کی گئی اور حکام سے مطالبہ کیا گیا کہ ان واقعات کی غیر جانبدارانہ تحقیقات کرائی جائے طلباء سے بھی اپیل کی گئی کہ وہ کسی کا آلۂ کار نہ بنیں اور آپس میں اتحاد قائم رکھیں اسٹوڈنٹس وائس راولپنڈی کے جنرل سیکرٹری سید افضل مرزا نے آج ایک بیان میں کہا کہ گارڈن کالج میں عبدالمالک کے قتل کے بارے میں طلباء کی بعض تنظیموں کا یہ اصرار کہ قتل سیاسی نوعیت کا نہیں تھا اس سانحہ کے اصل پس منظر کو عیاں کر دیتا ہے انہوں نے مطالبہ کیا کہ راولپنڈی میں طلباء پر تشدد کے واقعات کی ہائی کورٹ کے جج سے تحقیقات کرائی جائے پی پی آئی کے مطابق گورنمنٹ ڈگری کالج اسٹوڈنٹس یونین کے جنرل سیکرٹری نواز رضا نے کہا ہے کہ گارڈن کالج میں جو افسوسناک واقعہ ہوا تھا اسے کسی سیاسی پارٹی کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال نہیں کرنا چاہیے پشاور کے تین طالب علم لیڈروں انیس باقر (نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن کاظمی گروپ) جاوید ابراہیم پیرزادہ (صدر جمعیت طلباء اسلام) اور نثار شنواری (صدر پختون اسٹوڈنٹس فیڈریشن) نے آج ایک مشترکہ پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے جماعت اسلامی پر سخت نکتہ چینی کی اور کہا کہ وہ راولپنڈی کے عبدالمالک کے قتل کو نظریاتی رنگ دینے کی کوشش کر رہی ہے انیس باقر نے کہا کہ ان کے کوہاٹ کے حالیہ دورے میں این ایس ایف کے وفد نے مرحوم عبدالمالک کے والد مسٹر عبدالواحد سے ملاقات کی تھی جو ایبٹ آباد میں ٹھیرے ہیں وفد نے ان سے تعزیت کا اظہار کیا اور انہوں نے وفد کو بتایا کہ ان کے بیٹے عبدالمالک کا قتل اسلام اور سوشلزم میں تصادم کا نتیجہ نہیں بلکہ قطعی طور پر فریقین میں ذاتی اختلافات کا شاخسانہ ہے مسٹر عبدالواحد نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ بعض سیاسی پارٹیاں اس واقعہ کو اسلام اور سوشلزم کے جھگڑے کا نتیجہ قرار دے رہی ہیں۔

اُردو ڈائجسٹ

ایک صاف ستھرا ماہنامہ ہی نہیں، عصرِ حاضر کی برائیوں کے خلاف ہمہ گیر تحریک بھی ہے۔

اکتوبر ۶۹ء کے شمارے کی ایک جھلک

بلوچستان کے بائیس برس

"بلوچستان کی سچی کہانی" کے بعد الطاف حسن قریشی کا ایک اور معرکتہ الآرا تجزیاتی مضمون جس میں قیامِ پاکستان سے اب تک بلوچستان کے تمام اہم واقعات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

اسرائیل نے لندن میں جنم لیا

امریکہ کے صدر ولسن سے لے کر برطانیہ کے وزیراعظم چرچل تک یورپ اور امریکہ کے لیڈروں نے اسرائیل کی ناپاک ریاست کو وجود میں لانے کے لیے کیا کارہائے نمایاں انجام دیے۔ برطانوی صحافی ڈگلس ریڈ کی نایاب کتاب کی تلخیص، پہلی بار اُردو زبان میں۔

سمرقند و بخارا کے مسلمانوں پر کیا گزری

مسجد کے دروازے پر دو کمونسٹ کھڑے تھے اور مسلمان عورتوں کے سر سے بُرقعے، چادریں اور دوپٹے اُتار اُتار کر مسجد کے صحن میں ڈھیر کرتے جاتے تھے ——— ایک تُرکستانی مہاجر کے قلم سے جو آج کل پاکستان میں ہیں۔

آسمان سے اُترنے والے بَونے

دُنیا کے مختلف حصّوں میں بے شمار لوگوں نے آسمان سے نیلے رنگ کے بونوں کو اُترتے دیکھا ہے۔ اس مضمون میں اخبارات کے حوالوں سے ان سب واقعات کو جمع کر دیا گیا ہے۔ یہ سنسنی خیز انکشافات آپ کو چونکا دیں گے۔

۳۰ کروڑ چھُرے

یہ چھُرے بھارت کے مُسلمانوں کے لیے تیز کیے جا رہے ہیں۔ اس مضمون سے آپ کو اندازہ ہو جائے گا، برہمن ذہنیت مُسلمانوں کے خُون سے ہاتھ رنگنے کے لیے کیسے کیسے بہانے تلاش کرتی ہے۔

مینجر اُردو ڈائجسٹ سمن آباد۔ لاہور

R.L. No. 7564 PHONE : 62609
WEEKLY Zindagi LAHORE

۶ نکات کی سچّی تصویر

الطاف حسن قریشی

یہ تصویر تین برس پہلے "محبّت کا زمزم بہہ رہا ہے" کے عنوان
سے تیّار ہوئی۔ اہلِ نظر کہتے ہیں آج تک اس سے بہتر سیاسی
تصویر نظر سے نہیں گزری۔

- مشرقی پاکستان کا فکری اور سیاسی پس منظر۔
- چھ نکات کی کہانی شیخ صاحب کی زبانی۔
- چھ نکات کے پردۂ زنگاری کے پیچھے کون ہے؟
- مشرقی پاکستان کے حقیقی مسائل اور ان کا قابلِ عمل حل۔

مشرقی پاکستان کے دل میں جھانکنے کے لیے
اس کتاب کا مطالعہ نہایت ضروری ہے

قیمت : ۵۰ء۱ روپے

مکتبۂ اُردو ڈائجسٹ، سمن آباد ــــ لاہور